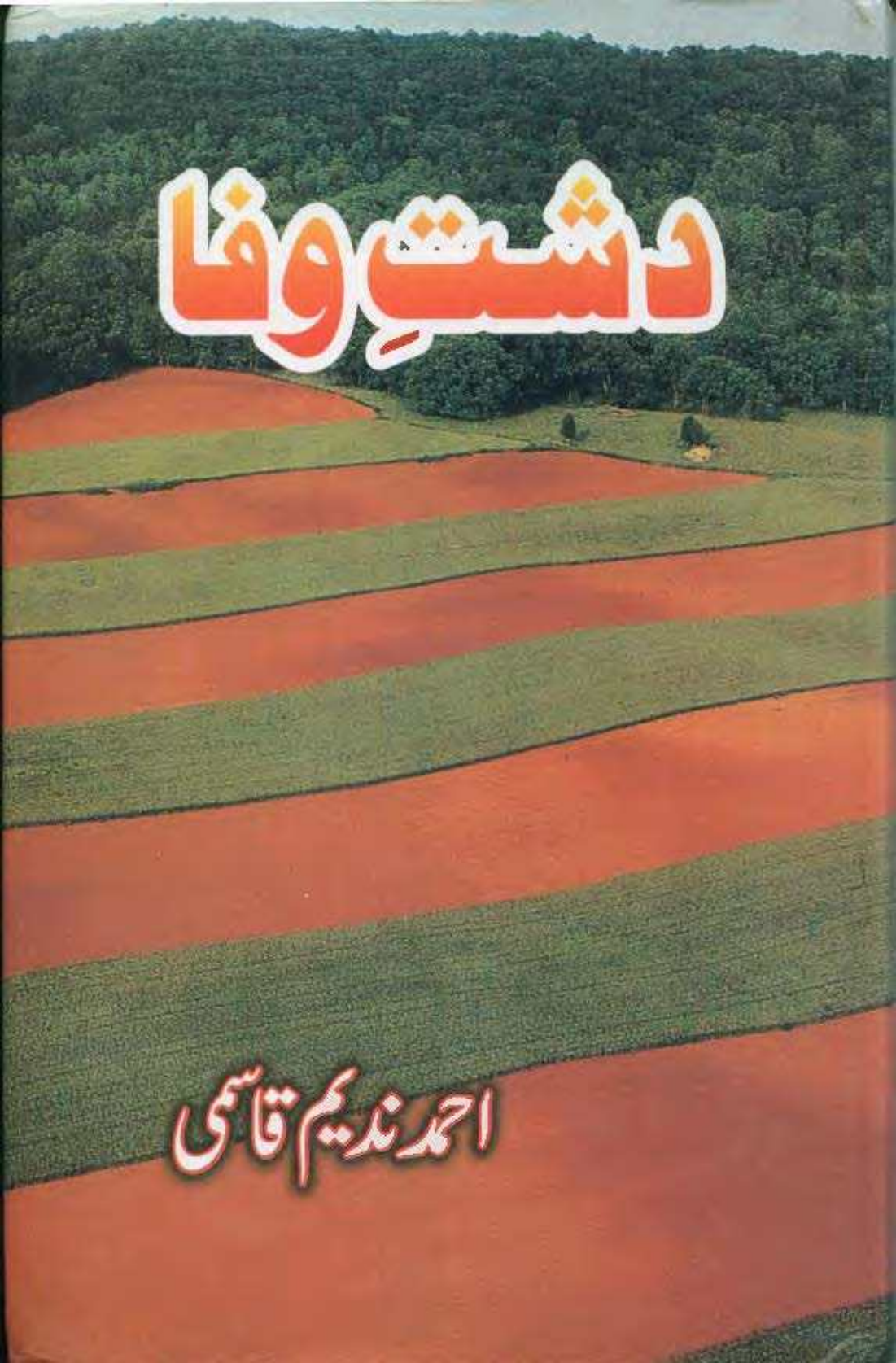
دشتِ وفا
احمد ندیم قاسمی

دشتِ وفا

(شاعری)

احمد ندیم قاسمی

اساطیر۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

کتاب	دشتِ وفا
اہتمام	منصورہ احمد (اساطیر)
کتابت	محمد حسین شاہ
سرورق	آغا نثار
مطبع	شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور
تعداد	ایک ہزار
سنہ اشاعت	مارچ 2000 (اکیسواں ایڈیشن)
قیمت	260 روپے

اساطیر

میاں چیمبرز، 3 ٹیمپل روڈ، لاہور

فون 6304820

اِنتساب

اک کشتۂ غم پہ مہرباں ہو — تم کتنے عجیب حکمراں ہو
تم حسن کا نقشِ جاوداں ہو — تم میری وفا کا امتحاں ہو
تم میرے یقیں ہو یا گماں ہو — میرے ہو مگر مرے کہاں ہو
ہو لالۂ دشتِ نارسائی — لیکن مرے خون میں رواں ہو
برسوں کی جُدائی کی قسم ہے — تم وقت کی طرح بیکراں ہو
بکھری ہُوئی کائناتِ دل پر — چھائے ہُوئے مثلِ آسماں ہو

سوگند مجھے خلوصِ فن کی
تم میری نفاستِ بیاں ہو

فہرس

۱— حرفِ اوّل ، ۱۵
۲— اجمالاً (فراق گورکھپوری) ، ۱۷
۳— دشتِ وفا ، ۱۹
۴— ایوانِ سحر میں ، ۲۰
۵— گو دھند میں تا کمر گیا چاند ، ۲۵
۶— حیراں حیراں کونپل کونپل، کیسے کھلتے پھول یہاں ، ۲۷
۷— شباب کے پھول ، ۲۸
۸— شام کو صبح چمن یاد آئی ، ۲۹
۹— منظر اور پس منظر ، ۳۰
۱۰— تاریخ ، ۳۲
۱۱— دردِ وطن ، ۳۳
۱۲— سونا ، ۳۴

۱۳— روایت ، ۳۵
۱۴— پلک پلک پہ جلائے ہیں اشکِ تر کے چراغ ، ۳۶
۱۵— فکر ، ۳۷
۱۶— قطعہ ، ۳۹
۱۷— یہاں سے وہاں تک ، ۴۰
۱۸— پابندی ، ۴۴
۱۹— لالہ و گل کے جو سامان بہم ہو جاتے ، ۴۵
۲۰— شام کب آگئی ، ۴۶
۲۱— سوچتا ہوں ، ۴۸
۲۲— قطعہ ، ۴۹
۲۳— اب ساری خدائی ہے تماشائی ہماری ، ۵۰
۲۴— تین اشعار ، ۵۱
۲۵— محفلِ شب ، ۵۲
۲۶— حسن و جمال کا واسطہ ، ۵۷
۲۷— خود فریبی کے نکل آئے ہیں کتنے پہلو ، ۵۹
۲۸— قطعہ ، ۶۱
۲۹— انجمیں اُجڑ گئیں ، اُٹھ گئے اہلِ انجمن ، ۶۲
۳۰— تُو جو بدلا تو زمانہ ہی بدل جائے گا ، ۶۳
۳۱— امکان ، ۶۴
۳۲— سفر اور ہم سفر ، ۶۵
۳۳— بزمِ انساں میں بھی اک رات بسر کر دیکھو ، ۶۶
۳۴— کیا بھروسا ہو کسی ہمدم کا ، ۶۷
۳۵— قطعہ ، ۶۹

۳۶— نیا فلک ہو رہا ہے پیدا ، نئے ستارے نکل رہے ہیں ، ۷۰
۳۷— کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں ، ۷۱
۳۸— نہ محبت نہ صباحت فانی ، ۷۲
۳۹— اک دمکتا ذہن بھی ہوں ، اک سُلگتا دل بھی ہوں ، ۷۵
۴۰— راستے ، ۷۷
۴۱— ہم اپنے چراغ کیوں بجھائیں ، ۷۹
۴۲— گجر بجا دو ، ۸۱
۴۳— وہ دھندلکا جسے سب حدِ نظر کہتے ہیں ، ۸۴
۴۴— حُسن ، ۸۵
۴۵— جمیلہ ، ۸۹
۴۶— چلے بہشت سے ہم نکہتِ بہار کے ساتھ ، ۹۰
۴۷— ایشیا ، ۹۱
۴۸— جیسے جیسے لوگ حق کے رازداں بنتے گئے ، ۹۲
۴۹— یاد ، ۹۴
۵۰— پھر یاد وہ مہ جمال آیا ، ۹۶
۵۱— قطعہ ، ۹۸
۵۲— ہم ، ۹۹
۵۳— ایک منظر ، ۱۰۱
۵۴— قطعہ ، ۱۰۳
۵۵— کھنڈر ، ۱۰۴
۵۶— لبِ خاموش سے افشا ہوگا ، ۱۰۵
۵۷— قطعہ ، ۱۰۷
۵۸— دعوت ، ۱۰۸
۵۹— قطعہ ، ۱۰۹

۶۰— تضاد ، ۱۱۰
۶۱— قطعہ ، ۱۱۱
۶۲— قطعہ ، ۱۱۲

حبسیات

۶۳— ایک شعر ، ۱۱۴
۶۴— قطعہ ، ۱۱۵
۶۵— فاصلے کے معنی کا کیوں فریب کھاتے ہو ، ۱۱۶
۶۶— قطعہ ، ۱۱۷
۶۷— بارش ، ۱۱۸
۶۸— قطعہ ، ۱۱۹
۶۹— مر کر بھی نہ ہوں گے رائیگاں ہم ، ۱۲۰
۷۰— قطعہ ، ۱۲۱
۷۱— قطعہ ، ۱۲۲
۷۲— ایک رات ، ۱۲۳
۷۳— قطعہ ، ۱۲۵
۷۴— قطعہ ، ۱۲۶
۷۵— دامن کو نہ تار تار کرلے ، ۱۲۷
۷۶— قطعہ ، ۱۲۹
۷۷— اشعار ، ۱۳۰
۷۸— قطعہ ، ۱۳۱
۷۹— پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک ، ۱۳۲
۸۰— قطعہ ، ۱۳۴

۸۱— قطعہ ، ۱۳۵
۸۲— صبح اگہی ، ۱۳۶
۸۳— قطعہ ، ۱۳۸
۸۴— تیری محفل بھی مداوا نہیں تنہائی کا ، ۱۳۹
۸۵— قطعہ ، ۱۴۱
۸۶— ایک شعر ، ۱۴۲

۸۷— پسِ پردہ ، ۱۴۳
۸۸— قطعہ ، ۱۴۶
۸۹— ایک جھونکا ، ۱۴۷
۹۰— کچھ دل سے نگاہ بدگماں ہے ، ۱۴۹
۹۱— میں ہوں یا تُو ہے ، خود اپنے سے گریزاں جیسے ، ۱۵۱
۹۲— خشک پتے ، ۱۵۴
۹۳— شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو ، ۱۵۶
۹۴— قطعہ ، ۱۵۸
۹۵— یوں تو اس جلوہ گہِ حسن میں کیا کیا دیکھا ، ۱۵۹
۹۶— نیا سال ، ۱۶۱
۹۷— قطعہ ، ۱۵۸
۹۸— نارسائی کی قسم ، اتنا سمجھ میں آیا ، ۱۶۴
۹۹— یار کا چاند ، ۱۶۶
۱۰۰— سانس لینا بھی سزا لگتا ہے ، ۱۶۷
۱۰۱— کتنے نالے تھے جو شرمندۂ تاثیر ہوئے ، ۱۶۹
۱۰۲— اے مشیت ، تری قوت کو سلام ، ۱۷۱

۱۰۳ — کون جگ میں ترا ہمسر دیکھے ، ۱۷۳
۱۰۴ — نذرِ فن کارانِ وطن ، ۱۷۵
۱۰۵ — شامِ فراق ، ۱۷۸
۱۰۶ — توحید ، ۱۸۰
۱۰۷ — تہذیب ، ۱۸۲
۱۰۸ — قطعہ ، ۱۸۳
۱۰۹ — سچ ، ۱۸۴
۱۱۰ — یہاں سے دُور نہ ہوگا دیارِ موسمِ گل ، ۱۸۶
۱۱۱ — دعویٰ تو کیا حسنِ جہاں سوز کا سب نے ، ۱۸۸
۱۱۲ — گل ترا رنگ چُرا لائے ہیں گلزاروں میں ، ۱۸۹
۱۱۳ — انقلاب اپنا کام کر کے رہا ، ۱۹۱
۱۱۴ — خدیجہ زہرہ ، ۱۹۳
۱۱۵ — بیکار ہے گرہ ترے بندِ نقاب کی ، ۱۹۵
۱۱۶ — تین سرزمینیں ، ۱۹۷
۱۱۷ — اپنی آنکھوں میں بسالی تری حیرت میں نے ، ۱۹۹
۱۱۸ — ہر ذہن میں منزل کا تصوّر تھا ہوائی ، ۲۰۱
۱۱۹ — قطعہ ، ۲۰۳
۱۲۰ — مرا غرور ، تجھے کھو کے ہار مان گیا ، ۲۰۴
۱۲۱ — ڈھلان ، ۲۰۵
۱۲۲ — ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر ، ۲۰۶
۱۲۳ — دیوانہ ، ۲۰۸
۱۲۴ — ڈھلتی ہوئی آنسو ، ہوا بھرتی ہوئی آہیں ، ۲۰۹
۱۲۵ — بہار ، ۲۱۱

۱۲۶ — یہ راز ہے جو ازمرے انتظار کا ، ۲۱۲
۱۲۷ — یہ ستارے ، ۲۱۴
۱۲۸ — آگیا راس شکستوں کا شمار آخر کار ، ۲۱۵
۱۲۹ — مراجعت ، ۲۱۷
۱۳۰ — قطعہ ، ۲۱۹
۱۳۱ — جدید انسان ، ۲۲۰
۱۳۲ — محور ہے یہی خواجگیِ کون و مکاں کا ، ۲۲۲
۱۳۳ — روح لبوں تک آ کر سوچے ، ۲۲۳
۱۳۴ — قطعہ ، ۲۲۵
۱۳۵ — فنونِ لطیفہ ، ۲۲۶
۱۳۶ — کون سنے ، ۲۲۸
۱۳۷ — عرش پر جا کے بھی جو خاک نشیں ہوتا ہے ، ۲۳۰
۱۳۸ — تُو بگڑتا بھی ہے خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ ، ۲۳۱
۱۳۹ — سوداگرِ حسنِ سخن ، ۲۳۳
۱۴۰ — شبِ فراق کو جب مژدۂ سحر آیا ، ۲۳۴
۱۴۱ — قطعہ ، ۲۳۵
۱۴۲ — یوں تو پہنے ہوئے پیراہنِ خار آتا ہوں ، ۲۳۶
۱۴۳ — کیا کہوں ، اب تجھ کو اپنا کر بھی کیوں افسردہ ہوں ، ۲۳۸
۱۴۴ — جنگل کی آگ ، ۲۳۹
۱۴۵ — دیارِ عشق کا یہ حادثہ عجیب سا تھا ، ۲۴۰
۱۴۶ — پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں ، ۲۴۱
۱۴۷ — قطعہ ،
۱۴۸ — وہی بہشت کی رعنائیوں سے بیزاری ، ۲۴۴

۱۴۹ — طوائف ، ۲۴۶
۱۵۰ — کٹی پتنگ ہے ساری دُنیا کی نظروں میں سمائی ہوئی ، ۲۴۸
۱۵۱ — ریستوران ، ۲۵۰
۱۵۲ — پھول ہیں گلشن میں کچھ خوابیدہ ، کچھ بیدار سے ، ۲۵۳
۱۵۳ — جواز ، ۲۵۵
۱۵۴ — ہجر و وصال ، ۲۵۷
۱۵۵ — مشرق و مغرب ، ۲۵۹
۱۵۶ — **فردیات** ، ۲۶۵
۱۵۷ — تکملہ (ندیم کی شاعری) مولانا غلام رسول مہر ، ۲۷۳

حرفِ اوّل

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

(غالب)

اجمالاً

مکروہات اور مصروفیاتِ زندگی نے مجھے اس سعادت سے ان دنوں محروم کر رکھا ہے کہ کسی بڑے اور کامیاب شاعر کے کارناموں پر کچھ جم کر لکھ سکوں۔ اسی لیے احمد ندیم قاسمی کی شاعری پر اپنے تاثرات اجمالی طور پر ظاہر کر رہا ہوں۔

ندیم کی آواز جداگانہ انفرادیت اور شخصیت رکھتی ہے۔ آج ہمارے چوٹی کے شاعروں میں ندیم ایک ممتاز مقام پر نظر آ رہے ہیں۔ ان کی آواز نے تہذیب و تربیت یافتہ قلوب میں گھر بنا لیا ہے اور اگر ایسے قلوب بھی ہیں جن میں ابھی ندیم کی آواز نے گھر نہیں بنایا تو اسے ان قلوب میں گھر بنا لینا چاہیے۔

ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائلِ زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں۔ ان کی آواز میں زندگی کے خواب، زندگی کے درد، زندگی کی فتوحات اور ان فتوحات سے بڑھ کر اہم چیز، زندگی کی شکستیں، گہرے اور پُرخلوص سوچ کے عناصر سب مل کر حل ہو گئے ہیں، اور ان کے نغمے فضائے زندگی میں وہ گونج پیدا کر رہے ہیں۔ وہ جھنکاریں اُٹھا رہے ہیں۔ اس کھنک کو جنم دے رہے

ہیں جو شاعر اور شاعری کو لازوال بنا دیتی ہیں اور جو ہمیں زندگی کی گہرائیوں اور بلندیوں کی سیر کراتی ہیں اور بہت دُور تک نیر کراتی ہیں اور ہماری زندگی کو ناقابلِ فراموش تجربات سے اور اُن مول احساسات سے مالا مال کر دیتی ہیں۔

پنجاب کی سرزمین سے ہی ایسا شاعر اُٹھ سکتا تھا جس کی شخصیت میں نرمی اور کس بل کا حسین ترین سنگم نظر آئے اور توانائی اور نزاکت جس کی شاعری کی جان ہو۔ ندیم کے اشعار کے پیچھے لمبے اور گہرے سوچ کا بہت بڑا پس منظر ہوتا ہے۔ یہی سوچ ان کے کلام میں وہ چوٹیلا پن اور وہ کاٹ پیدا کر دیتا ہے جو صحت مند شاعری کی خصوصیت ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ ندیم ہرگز کسی سطحی رو کے تحت شعر نہیں کہتے، بلکہ بہت ڈوب کر شعر کہتے ہیں۔ ان کی آواز میں جھول نہیں پڑتا۔ ان کی آواز کی رگیں ڈھیلی نہیں ہیں۔ ان کی شاعری ان کی ریاضتِ داخلی کی پیداوار ہے جو ان کے موضوعات کو جلال و جمال بخشی ہے۔ جو ان کے الفاظ کی "رم جھم" کو گہربار بنا دیتی ہے — جو "شعلۂ گل" میں کوندے کی لپک پیدا کر دیتی ہے اور "دشتِ وفا" میں پُروقار محبت کے پھول کھلاتی ہے جو ذات اور کائنات کو ہم آہنگ کر دیتی ہے۔

الہ آباد (ہند)
۲۰ نومبر ۱۹۶۱ء

فراق گورکھپوری

دشتِ وفا

دوست کہتے ہیں — "ترے دشتِ وفا میں، کیسے
اتنی خوشبو ہے، مہکتا ہو گلستاں جیسے؟"

گو بڑی چیز ہے غم خوارئ اربابِ وفا
کتنے بیگانۂ آئینِ وفا ہیں یہ لوگ
زخم در زخم محبت کے چمن زار میں بھی
فقط اک غنچۂ منطق کے گدا ہیں یہ لوگ

میں اُنھیں گلشنِ احساس دکھاؤں کیسے
جن کی پروازِ بصیرت پر بلبل تک ہے
وہ نہ دیکھیں گے کبھی حدِ نظر سے آگے
اور مری حدِ نظر، حدِ تخیل تک ہے

دل کے بھیدوں کو بھی منطق میں جو اُلجھاتے ہیں
یوں سمجھ لیں — کہ ببولوں میں بھی پھول آتے ہیں

ایوانِ سحر میں

یہ شب ہے یا مرے دل کا سکوتِ بے پایاں
یہ دل ہے یا مرے مرقد پہ جل رہا ہے چراغ
کچھ ایسے ٹوٹ رہی ہیں رگیں تخیّل کی
کہ جیسے تندیِ مے سے چٹخ رہا ہو ایاغ
ہوا چلی، کہ مشیّت کو دل لگی سوجھی
سمندروں سے نہ پوچھو کبھی صدف کا سراغ

ہر ایک چیز میں گہرائی ہے، تحیّر ہے
ہوا کے بھیس میں اُمڈے سکوت کے دھارے
یہاں تو گُل بھی مرے ہم نصیب ہی نکلے
کہ تیرگی میں گھُلے جا رہے ہیں بے چارے
اندھیری شام سے محسوس ہو رہا ہے مجھے
کہ جیسے جھیل کی تہ تک اُتر گئے تارے

نشیبِ شام سے بُرجِ سحر کی چوٹی تک
تمام رینگتے کہُرے، تمام سناٹے
تھکے تھکے ہیں کچھ اس طرح وقت کے تیور
کہ جیسے شیر، ہرن کو چبا کے لب چاٹے
سُنا ہے، ایسی ہی شب ہائے تار تھیں جن میں
بڑے وقار سے اجداد نے سفر کاٹے

مری نگاہ سے اوجھل ہے کاروانِ سحر
مگر جرس کی صدا تھی کہ رات بھر نہ تھمی
سجے تھے اوس کے موتی قبائے گلشن پر
مجھے یہ وہم، کہ آغوشِ گل میں برف جمی
جو آنسوؤں نے سرِ بامِ دل جلائے تھے
بجھا گئی وہ دیئے، دامنِ صبا کی نمی

افق لرزنے لگا، رات کے قدم اُکھڑے
سحر کے بند دریچے پہ کیوں نہ دستک دوں
ستارۂ سحری نے مجھے نہ پہچانا
تو کیا وطن میں پہنچ کر بھی اجنبی ہی رہوں؟
یہ اور بات، مجھے تابِ ضبط ہو کہ نہ ہو
سحر کی انجمنِ نور میں قدم تو دھروں

قدم بڑھا تو چھنکنے لگی ہیں زنجیریں
نظر اُٹھی تو دکھائی دیے کئی احباب
کسی کے دوش پہ ہل تھا، کسی کے ہاتھ میں پھول
کسی کے پاس درانتی، کسی کے پاس کتاب
دمک رہا تھا وہ پندار ان کے چہروں پر
دیا ہے اہلِ حکم نے جسے جنوں کا خطاب

مگر عجب کہ عروسِ سحر ہوئی بیدار
تنی ہوئی ہے فضا پر بسیط انگڑائی
اٹھی افق سے وہ محبوبۂ شگفتہ مزاج
جو شب کو پردہ نشیں تھی تو دن کو ہرجائی
زمیں سے تابہ فلک رنگ لہلہانے لگے
مگر یہ دھند سی کیسا ذہن پہ اُتر آئی

میں سوچتا ہوں، سحر نے مجھے شعور دیا
مگر یہی، کہ سلاسل کے سلسلے ہیں طویل
مچل رہی ہیں شعاعیں۔ ابل رہا ہے لہو
اُمڈ رہی ہے تجلی ___ اُبھر رہی ہے فصیل
چمک تو خوب تھی لیکن جھلس گئے ہیں بدن
نہ جانے شعلۂ نمرود تھا کہ باغِ خلیل

سحر کا ایک ہی مفہوم ہے، — طلوعِ سحر
مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں
شگفتِ گُل کو تو ہے انتظارِ موسمِ گُل
وہ لاکھ نوکِ سناں سے کلی کا دل چیریں
کچھ اور نام ہے اس کا، یہ فصلِ گُل تو نہیں
کہ بوئے گُل کے لیے ڈھل رہی ہیں زنجیریں

نومبر ۱۹۵۲ء

غزل

گو دُھند میں تا کمر گیا چاند
نظروں میں مگر ٹھہر گیا چاند

شبنم کو شرار کر گیا چاند
آنکھوں میں غبار بھر گیا چاند

راہوں کو ٹٹولتے رہے تم
بادل میں اُدھر اُتر گیا چاند

جب ہجر کی رات چاند ڈوبا
دل چیخ اُٹھا کہ مر گیا چاند

اے دردِ فراق کے اندھیرو
کیا ہو گئے گُل؟ کدھر گیا چاند

اُجلا سا غبار ہے اُفق پر
اس راہ سے کس کے گھر گیا چاند

اے ٹوٹتے آسرے، لُٹے ہم
اے سوچتے رہگزر، گیا چاند

تم کاکشں، کرن کی چاپ سُنتے
میرے لیے در بدر گیا چاند

اب آئے ہو آفتاب لے کر
ظلمات سے جب گزر گیا چاند

آنسو بھی نہیں کہ دل کو رو لیں
تارے بھی گئے، جدھر گیا چاند

دسمبر ۱۹۵۲ء

غزل

حیراں حیراں کونپل کونپل، کیسے کھلتے پھُول یہاں
تنے ہُوئے کانٹوں کے ڈر سے پُوجی گئی ببول یہاں

کلیاں فوکِ سناں سے چٹکیں، غنچے کٹ کے شگفتہ ہُوئے
کاش یہ فصلِ خونِ بہاراں اور نہ کھینچے طول یہاں

شاید آج بھی جاری ہے آدم کا سلسلۂ اُفتاد
بھی نہ وہاں جنّت بھی گوارا اور قبول ہے دُھول یہاں

یارو یہ سناٹا توڑو، گیت نہیں تو چیخ سہی،
رُلوا نا فانون یہاں کا، رو لینا معمول یہاں

پل پل میں تاریخ چھپی ہے، گھڑی گھڑی گرداں ہے یہ تم
ایک صدی کی ہار بنے گی ایک نظر کی بھُول یہاں

۴ دسمبر ۱۹۵۲ء

شباب کے پھول

میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

وہ پھول جن سے بہار کی رہگزر پہ میں نے دیئے جلائے
بہار کی دیویوں کے قدموں کی چاپ کانوں میں گونجتی تھی
مرے ترستے ہوئے خیالوں کے آسمانوں میں گونجتی تھی
افق تک اپنے قلم سے میں نے شباب کے پھول یوں بچھائے
کہ جب بہاریں یہاں سے گزریں تو میری مہکار ساتھ جائے

میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

وہ پھول جن پر بہار کے روپ میں چلے گرد بادِ صحرا
وہ پھول وہ میرے شاہپارے مری امیدیں، مرے ارادے
شفق میں ڈوبے ہوئے پھریرے لہو میں بھیگے ہوئے لبادے
یہاں سے وہ قافلے نہ گزرے، فضا میں گونجی تھی چاپ جن کی
میں عمر بھر منتظر رہا ہوں، گواہ گردش ہے رات دن کی

میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

جنوری ۱۹۵۳ء

غزل

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

چاند جب دُور اُفق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

دن شعاعوں سے الجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

فروری ۱۹۵۳ء

منظر اور پس منظر

احساس کے داغ جل رہے ہیں
ذہنوں میں چراغ جل رہے ہیں
پربت کی طرح ہے رات بھاری
خاموش ہے کائنات ساری
پلکوں سے جب اشک پھوٹتا ہے
دھرتی کا جمود ٹوٹتا ہے

جھرنوں کی صدائیں آ رہی ہیں
پیڑوں میں ہوائیں گا رہی ہیں
جھیلوں میں نہا رہے ہیں تارے
پانی کو جلا رہے ہیں تارے
وادی میں بکھر گئے ہیں جگنو
سبزے میں اُتر گئے ہیں جگنو

آنکھوں میں لیے اجاڑ بن سے
ہم لوگ تو چُور ہیں تھکن سے
راتوں سے اَٹی ہُوئی نگاہیں
صدیوں سے ٹٹولتی ہیں راہیں
منظر کو یہ ضد ہے، مسکرائیں
ہونٹوں کی نمی کہاں سے لائیں

اگست ۱۹۵۳ء

تاریخ

راہوں پہ جھکی ہوئی چٹانیں
دھرتی کی جلی ہوئی زبانیں
صدیوں کی صداؤں کو سمیٹے
عمروں کے غبار کو لپیٹے
بڑھتا مجھے دیکھ کر فضائیں
کہتی ہیں سکوت کی صدائیں
تاریخ کی آگ جل رہی ہے
اِک اور زباں نکل رہی ہے

اگست ۱۹۵۳ء

—

دردِ وطن

ہم سیاست سے محبت کا چلن مانگتے ہیں
شبِ صحرا سے مگر صبحِ چمن مانگتے ہیں
وہ جو اُبھرا بھی تو بادل میں لپٹ کر اُبھرا
اسی بچھڑے ہوئے سورج سے کرن مانگتے ہیں
کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں
ایسے غنچے بھی تو گلچیں کی قبا میں ہیں اسیر
بات کرنے کو جو اپنا ہی دہن مانگتے ہیں
فقط اس جرم میں کہلائے گنہ گار، کہ ہم
بہرِ ناموسِ وطن، جامۂ تن مانگتے ہیں
ہم کو مطلوب ہے تکریمِ قد و گیسو کی
آپ کہتے ہیں کہ ہم دار و رسن مانگتے ہیں
لمحہ بھر کو تو بُھلا جاتے ہیں نعرے لیکن
ہم تو اے اہلِ وطن، دردِ وطن مانگتے ہیں

اگست ۱۹۵۳ء

سونا

تم کہتے ہو آفتاب اُبھرا
میں کہتا ہوں جل رہا ہے سونا
پیڑوں سے گزر رہی ہیں کرنیں
ہاتھوں سے نکل رہا ہے سونا
مشرق کی تمازتِ اَنا سے
مغرب میں پگھل رہا ہے سونا

ستمبر ۱۹۵۲ء

روایت

قدموں کے نقوش ہوں کہ چہرے
قبروں کے گلاب ہوں کہ سہرے
تاریخ کے بولتے نشاں ہیں
تہذیب کے سلسلے رواں ہیں
یہ رسمِ جہاں قدیم سے ہے
آدم کا بھرم ندیم سے ہے

ستمبر ۱۹۵۳ء

غزل

پلک پلک پہ جلائے ہیں اشکِ تر کے چراغ
بھڑک اُٹھے ہیں شبِ ہجر کی سحر کے چراغ

جدائیوں کے گھنے جنگلوں میں عمر کٹی
لویں سمیٹ کے سوتے رہے سفر کے چراغ

یہ گل ہیں یا ترے رو کے ہُوئے تبسم ہیں
یہ کون دشت میں لایا ہے میرے گھر کے چراغ

جھکا لیا ہے بھری ڈالیوں کو گلچیں نے
بجھا رہا ہے کوئی میرے بام و در کے چراغ

مسافروں سے کہو، رات سے شکست نہ کھائیں
میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کے چراغ

مکالماتِ فلاطوں ہوں یا ندیم کے شعر
کوئی بجھا نہ سکا فطرتِ بشر کے چراغ

نومبر ۱۹۵۳ء

فکر

راتوں کی بسیط خامشی میں
جب چاند کو نیند آ رہی ہو
پھولوں سے لدی خمیدہ ڈالی
لوری کی فضا بنا رہی ہو

جب جھیل کے آئنے میں گھُل کر
تاروں کا خرام کھو گیا ہو
ہر پیڑ بنا ہُوا ہو تصویر
ہر پھُول سوال ہو گیا ہو

جب خاک سے رفعتِ نما تک
اُبھری ہُوئی وقت کی شکن ہو
جب میرے خیال سے خدا تک
صدیوں کا سکوت خیمہ زن ہو

اُس وقت مرے سلگتے دل پر
شبنم سی اُتارتا ہے کوئی
یزداں کے حریمِ بے نشاں سے
انساں کو پکارتا ہے کوئی

دسمبر ۱۹۵۳ء

قطعہ

چاند نکلا ہے سرِ بام لبِ بام آؤ
دل میں اندیشۂ انجام نہ آنے پائے
کچھ اس انداز سے اُترو مری تنہائی میں
کھوج میں گردشِ ایام نہ آنے پائے

یہاں سے وہاں تک

مژدۂ عشرتِ جمہور ہو یا وعدۂ وصل
ایک احساس کے دو رُخ ہیں — جدید اور قدیم

آندھیاں ہانپتی ہیں جیسے گھنے جنگل میں
گنگناتی ہے اسی طرح گلستاں میں نسیم

شب حقیقت ہے مگر اس کے بھی دو پہلو ہیں
چاند نکلا ہے سرِ کلبۂ احزانِ ندیم

کائنات ایک لڑی ہے کئی دنیاؤں کی
میں نے دیکھا ہے مگر دانۂ گندم بھی دونیم

ان کا مقصد فقط آرائشِ تن، حفظِ بدن
وہ سکندر کی عبا ہو کہ قلندر کی گلیم

ایک گل تھا، مگر اندازِ نظر کے فتنے!
ایک کو رنگ جچا، ایک کو راس آئی شمیم

عظمتِ فن کا تقاضا ہے کہ رعنائیِ فن
یوں حقیقت کو سمیٹے کہ حقیقت ہو لجائے
اس کی خلوت بھی جہانگیر ہو، جلوت بھی عظیم
اس کا اک پل بھی مجسم ابدیت ہو جائے
جوئے کہسار دیں، پتھر کا بنا کر زینہ
پنڈلیاں کھول کے اُتری ہیں حسینائیں چند
کس کو اپناؤں، تو کس کو نظرانداز کروں
ایک صف میں نظر آتی ہیں تمنائیں چند
ذہن کس مصر کے بازار میں لے آیا ہے
ایک یوسف کی خریدار زلیخائیں چند
اس کی آنکھوں میں نئی صبح کا شرمیلا پن
اُس کے ہونٹوں پہ کلی جیسے چٹکنے والی
اس کی ٹھوڑی میں ضیا بار، سحر کا تارا
اُس کے عارض میں اُفق تابِ شفق کی لالی
اس کے ابرو ہیں کہ غالب کی غزل کا مطلع
اُس کا ملبوس ہے یا تاج محل کی جالی
ان کو دیکھوں تو قیامت، جو نہ دیکھوں تو مجھے
وسعتِ دہر نظر آتی ہے خالی خالی

اک حسینہ ہو کہ جگمگٹ ہوں حسیناؤں کے
حسن اور اک گدازی سے نہیں باز آتا
یہ بصارت کی بہشتیں ہیں بڑی چیز مگر
کاشفِ فنکار کو پرواز کا انداز آتا

یہی پرواز — یہی سلسلۂ فکر رسا
اک حسینہ کے گھروندے میں مجھے لے آیا
میں سمجھتا تھا کہ معراج ہے آدم کی یہی
اور انسان کے آغاز کا نقشہ پایا
حلقۂ آسیہ میں حسن کی باہیں تھیں اسیر
اسی چکر میں مرا حسنِ نظر چکرایا
ہاں — یہی قوتِ تخلیق ہے تہذیب طراز
ہاں — یہی قوتِ تخلیق رہی بے مایہ
چاکِ دامن سے شفق بن کے جھلکتا ہے بدن
اور ماتھے پہ فروزاں ہے ستاروں کی تھکن
بکھرے بالوں میں ہے عنبر کے دھوئیں کا انداز
سرخیِ لب میں سلگتا ہے جوانی کا چمن
چاکِ دامن کو سیوں! حسنِ بدن کو دیکھوں!
ہائے کس طرح حقیقت کو سمیٹے مرا فن

یہ حقیقت بھی تو ہے حسن کی مانند عظیم
ہل کی ہتھی پہ اُتر آئے ہیں ہاتھوں کے نشاں
نظر افروز ہے پکتے ہوئے کھیتوں کا شباب
اور دل دوز ہے لٹتی ہوئی فصلوں کا سماں
یہ مسافت بھی تو فن کار کو ملے کرنا ہے
کس کی محنت کا ثمر، جا کے ٹپکتا ہے کہاں
یہ مسافت — یہ حقیقت کا بتدریج ادراک
شعر کا حسن بھی ہے، حسن کا عرفان بھی ہے
فصل سے قصر تک اُلجھے ہوئے رشتوں کا سراغ
فن کی پہچان بھی ہے، فن کا نگہبان بھی ہے
ایک پہلو میں بھی رکھتی ہے ہزاروں پہلو
میری دنیا کہ جو گل پوش بھی، ویران بھی ہے
سخت مشکل ہے کہ فن کار کمستاں کاٹے
اِک ذرا در و میسر ہو تو آسان بھی ہے
گُل کو دیکھوں تو نہ بھولے مجھے گلکار کا حُسن
یہ لطافت مرا مقصد بھی ہے، ایمان بھی ہے
مثلِ خورشید ہوئی ہے اُفقِ فن پہ طلوع
یہ حقیقت کہ جو شاعر ہے وہ انسان بھی ہے

فروری ۱۹۵۴ء

پابندی

میرے آقا کو گِلہ ہے کہ مری حق گوئی
راز کیوں کھولتی ہے

اور میں پوچھتا ہوں — تیری سیاست، فن میں
زہر کیوں گھولتی ہے

میں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا
رات دن رولتی ہے

یوں بھی ہوتا ہے، کہ آندھی کے مقابل چڑیا
اپنے پر تولتی ہے

اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر
بوند بھی بولتی ہے

اپریل ۱۹۵۴ء

غزل

لالہ و گُل کے جو سامان بہم ہو جاتے
فاصلے دشت و چمن زار میں کم ہو جاتے

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جاتے

——— ق ———

خود کو کھویا تو نہیں، تم کو نہ پایا، نہ سہی
تم کو پاتے تو اسی کیف میں ضم ہو جاتے

صرف ہم پر ہی نہ یہ حادثہ ہوتا موقوف
تم بھی اک معبدِ ویراں کے صنم ہو جاتے

فقط اک ذوقِ پرستش کی نقوش آرائی
دَیر اگر دَیر نہ ہوتے تو حرم ہو جاتے

ہم اگر دار پہ کھنچتے بھی تو اے صاحبِ دار
اپنی ناکردہ گناہی کی قسم ہو جاتے

جون ۱۹۵۴ء

شام کب آ گئی

کتنی شدّت سے یہ رات خاموش ہے
کتنی لامنتہی، کس قدر بے کراں
ایک پتّہ بھی گرتا ہے جب گھاس پر
مجھ کو ہوتا ہے جھنکار کا سا گماں

ایک روندی ہُوئی فصلِ گُل کی طرح
چاندنی شاہراہوں پہ سوئی ہُوئی
اک لوٹی ہُوئی سلطنت کی طرح
ایک شے دوسری شے میں کھوئی ہُوئی

جھاڑیاں چُپ ہیں، اور دم بخود ندیاں
بکھری مانگوں کی مانند پگڈنڈیاں
اکھڑے اکھڑے سے بادیوں کے نشاں
جیسے صدیوں کی اُجڑی ہُوئی بستیاں

میں تو دن کی مسافت میں مصروف تھا
جھٹپٹا کب ہُوا، شام کب آ گئی
اے مرے چاند، میرے رفیقِ سفر
میرے سورج کو کس کی نظر کھا گئی

کچھ تو زادِ سفر ساتھ لے کر چلوں
اے مرے فن، مجھے آگہی بخش دے
جس سے شمعیں جلیں میری ہر سانس میں
زندگی کو وہ تابندگی بخش دے

اپنے نغموں کی مربوط تکرار سے
اس سکوتِ مسلسل کو توڑوں گا میں
شب کا ماحول کتنا ہی پُرہول ہو
چوٹ کھا کر بھی رستہ نہ چھوڑوں گا میں
میرا سرمایہ تخلیقِ فن ہی تو ہے
دن کے ریزوں کو چُن چُن کے جوڑوں گا میں

جولائی ۱۹۸۴

سوچتا ہوں

میری کھڑکی کے شیشے پہ پھولوں کی اک بیل انگڑائیاں ٹوٹتے ٹوٹتے رُک گئی
اک حسینہ، سمندر کی دھوئی ہوئی ریت سے سیپیاں چُنتے چُنتے رُکی

اوس کے چند موتی جو پھولوں کے ماتھے پہ جھومر کی مانند رخشندہ ہیں
بیل کی بے حِسی سے ہیں بے بس، مگر کتنے مجبور ہیں، کیسے شرمندہ ہیں

سوچتا ہوں — اگر کوئی جھونکا نہ آیا تو کیا پھول چُپ چاپ مرجائیں گے؟
میرے ویران کمرے کے یہ قمقمے کیا یونہی تیرگی میں اُتر جائیں گے؟

اکتوبر ۱۹۵۴ء

قطعہ

جب چٹانوں سے لپٹتا ہے سمندر کا شباب
دُور تک موج کے رونے کی صدا آتی ہے
یک بیک پھر یہی ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی موج
اک نئی موج میں ڈھلنے کو پلٹ جاتی ہے

غزل

اب ساری خدائی ہے تماشائی ہماری
کچھ روز سے آباد ہے تنہائی ہماری

مٹ کر بھی ہیں حسرتی کے رگ و پے میں نمایاں
دیکھو تو ذرا انجمن آرائی ہماری

اب دامنِ صحرا پہ بھی دھوکا ہے چمن کا
گلگشت ہے اب بادیہ پیمائی ہماری

ہر لفظ میں ماضی کے کئی گیت گنبھے ہیں
تاریخ کی اک گونج ہے گویائی ہماری

جو پھول کھلا، اس میں گھلا خون ہمارا
جو جام بجا، اس میں کھنک آئی ہماری

جب حریتِ فکر کا دستور ہوا طے
خود جبرِ مشیت نے قسم کھائی ہماری

اگست ۱۹۵۵ء

تین اشعار

اگر اس دور میں جلنا ہی معتبر ٹھہرا
اپنی اُجڑی ہوئی محفل کے چراغوں میں جلیں

چنگ ٹوٹا، مگر آہنگ نہ ٹوٹا اپنا
ہم وہ شعلے ہیں جو بجھ کر بھی دماغوں میں جلیں

اک نئے موسمِ گل کا یہ تقاضا ہے کہ ہم
رنگ بن کر انہی لٹتے ہوئے باغوں میں جلیں

اکتوبر ۱۹۵۵ء

محفلِ شب

کتنی ویران ہے یہ محفلِ شب
نہ ستارے نہ چراغ

کہ گھنی دھند ہے گردوں پہ محیط
چاند ہے چاند کا داغ

پھیلتے جاتے ہیں منظر کے خطوط
بجھتا جاتا ہے دماغ

راستے گھل گئے تاریکی میں
توڑ کر زعمِ سفر

کون تا حدِ نظر دیکھ سکے
مٹ گئی حدِ نظر

سیکڑوں منزلیں طے کر تو چکے
لیکن اب جائیں کدھر

تو کہاں ہے نہ زمیں ہے شاید
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں

ان خلاؤں میں پکاریں تو کسے؟
کوئی سنتا ہی نہیں

ایک دنیا تو ہے یہ بھی، لیکن
اپنی دُنیا سی نہیں

دوستو، آؤ، قریب آ جاؤ
آ کے دیکھو تو سہی

ایک حلقے میں بجھی آنکھوں کو
لا کے دیکھو تو سہی

شاید آواز پہ آواز آئے!
گا کے دیکھو تو سہی

غزل

جب سحر برسرِ کہسار آئی!
وقت کے ہاتھ میں تلوار آئی

دن کٹا بھی تو اس اندیشے میں
پھر قیامت کی شبِ تار آئی

عل سے ٹکرا کے گزر آئے تھے

راہ میں پھر وہی دیوار آئی

ہم نے مانا کہ بہار آئی ہے

اپنی نگری میں تو بیکار آئی

ذہن میں یوں تو کئی پھول کھلے

ریگِ صحرا سے نہ مہکار آئی

ب پہ نوحہ ہو تو شب کیوں بہلے

پھر وہی شب، وہی ہم

لیت گایا کہ لہو ٹپکایا

اکھڑے جاتے ہیں قدم

یہ خموشی ہے کہ اک گنبدِ سنگ

جس میں گھٹ جائے گا دم

ت کرنے کا بہانہ ہی سہی

داستانیں ہی کہو

آپ بیتی ہو کہ جگ بیتی ہو

یوں مگر چپ نہ رہو

وقت کی چاپ نہیں آئے گی

وقت کے ساتھ چلو

اُونچے پیڑوں کی گندھی شاخوں میں

رات ہے نوحہ کناں

اتنا گاؤ کہ چیخ کر رہ جائیں

مجھ تیرگیاں

دھوپ کی طرح چمکتا ہُوا گیت

زندگی بخش، جواں

گیت

رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں

کل جہاں روح جھلس جاتی تھی

اپنے سائے سے بھی آنچ آتی تھی

آج اسی دشت پہ ساون کی لگی ہیں جھڑیاں

رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں

شب کو جو وادیاں سنسان رہیں

صبح یوں اوس سے آراستہ تھیں

ہر طرف موتیوں کی جیسے تنی ہوں لڑیاں
رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں

توڑ کر پاؤں نہ بیٹھو، آؤ!
صبح کے اور قریب آ جاؤ!

یوں تو ہر حال میں کٹتی ہی رہیں گی گھڑیاں
رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں

نومبر ۱۹۵۵ء

حسن و جمال کا واسطہ

(ایک شاعر سے خطاب)

اب تو وجدان بھی اک جنسِ تجارت بن کر
بک رہا ہے ترے کردار کے ساتھ
اک کھنکتی ہوئی زنجیر بھی شامل کر لی
تو نے گاتے ہوئے افکار کے ساتھ

حسنِ محبوب کا نیلام اٹھانے والے
معبدوں کو تو نہیں بیچتے لوگ
مانتا ہوں، غمِ افلاس پرانا غم ہے
غمِ انساں سے ہیں کمتر سب روگ

رنگِ گلزار ہو یا نغمۂ بلبلِ کہسار
کون بازار میں لائے گا انھیں
نیلگوں بحر کی وسعت ہو کہ صحرا کا سکوت
کون آئینہ دکھائے گا انھیں

فن کی تذلیل نہ کر، حسن کی توہین نہ کر
عارضِ لب کو ترازو سے اُتار
خندۂ گل بھی اگر بیچ دیا یاروں نے
خونِ گل سے بھی نہ ہوں گے بیدار

دسمبر ۱۹۵۸ء

غزل

وہ فریبی کے نکل آئے ہیں کتنے پہلو
ہو گئے اپنے طراروں میں گرفتار آہو

یہ نہ شبنم ہے، نہ بھٹکے ہوئے تاروں کا ہجوم
رات کی لاش پہ ٹپکے ہیں سحر کے آنسو

میں تو چپ تھا مگر اب موجِ حیا کے ہاتھوں
پھیلی جاتی ہے ترے حسن کی خوشبو ہر سو

توڑ کر جب بھی پرستش کا قفس دیکھا ہے
خمِ محراب سا لگتا ہے ہلالِ ابرو

جب بھی اُٹھی کوئی چلمن، مجھے محسوس ہو
میری آنکھوں پہ ہیں بکھرے ہوئے تیرے گیسو

نہ ترے حسن کی خوشبو، نہ ترے عشق کا رنگ
یوں تو گزرے مری نظروں سے ہزاروں گُل رُو

کن جہانگیر بہاروں کی تمنا میں ندیم
موسمِ گُل میں بھی اجڑا ہُوا لگتا ہے تو

اپریل ۱۹۵۶ء

قطعہ

تمتماتے ہیں سلگتے ہوئے رخسار ترے
آنکھ بھر کر کوئی دیکھے گا تو جل جائے گا

اتنا سیّال ہے یہ پل کہ گماں ہوتا ہے
میں ترے جسم کو چھُو لوں تو پگھل جائے گا

غزل

انجمیں اجڑ گئیں، اُٹھ گئے اہلِ انجمن
چند چراغ رہ گئے، جن کی لویں ہیں سینہ زن

اب ترا التفات ہے، حادثۂ جمال و فن
اندھے عقاب کی اڑان، زخمی ہرن کا بانکپن

ہائے یہ مختصر حیات، ہائے یہ اک طویل رات
اے مرے دوست، اک نظر۔ اے مرے چاند، اک کرن

حُسن اگر جھکا رہا، بر درِ خسروانِ دھر
کٹتے رہیں گے کوہسار مرتے رہیں گے کوہکن

اُترے ہیں برگہائے زرد لالہ و گُل کے رُوپ میں
ایسے نحیف جسم پر، اتنا مہین پیرہن

اپریل ۱۹۵۶ء

غزل

تُو جو بدلا تو زمانہ ہی بدل جائے گا
گھر جو سُلگا تو بھرا شہر بھی جل جائے گا

سامنے آ، کہ مرا عشق ہے منطق میں اسیر
آگ بھڑکی تو یہ پتھر بھی پگھل جائے گا

دل کو میں منتظرِ ابرِ کرم کیوں رکھوں
پھُول ہے، قطرۂ شبنم سے بہل جائے گا

موسمِ گُل اگر اس حال میں آیا بھی تو کیا
خونِ گُل، چہرۂ گلزار پہ مل جائے گا

وقت کے پاؤں کی زنجیر ہے رفتار، ندیم
ہم جو ٹھہرے تو اُفق دور نکل جائے گا

اکتوبر ۱۹۵۶ء

اِمکان

وقت کے دامنِ صد چاک میں اب کیا ہوگا
ایک فردا ہے تو فردا پہ بھی ڈالیں گے کمند
اتنی ہیبت سے ستاروں کی طرف مت دیکھو
یہ تو امکان کے پرچم ہیں خلاؤں میں بلند

چاند ابھی دور سہی، چاند کی باتیں نہ کرو
یہ ستارہ تو بس اک مرحلۂ شب ہوگا
اب تو ذہنوں کو ستاتا ہے فقط ایک سوال
عرش سے پار تک انساں کا سفر کب ہوگا

سفر اور ہمسفر

جنگل جنگل آگ لگی ہے، بستی بستی ویراں ہے
کھیتی کھیتی راکھ اڑتی ہے، دنیا ہے کہ بیاباں ہے
سنّاٹے کی ہیبت نے سانسوں میں پکاریں بھر دی ہیں
ذہنوں میں مبہوت خیالوں نے تلواریں بھر دی ہیں
قدم قدم پر جھلسے جھلسے خواب پڑے ہیں راہوں میں
صبح کو جیسے کالے کالے دیے عبادت گاہوں میں
ایک اک سنگِ میل میں کتنی آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی
ایک اک نقشِ قدم میں کتنی رفتاریں کفنائی ہوئی
ہم سفرو، اے ہم سفرو، کچھ اور بھی نزدیک آ کے چلو
جب چلنا ہی مقدر ٹھہرا، ہاتھ میں ہاتھ ملا کے چلو

غزل

بزمِ انساں میں بھی اک رات بسر کر دیکھو
ایک بار اپنی زمیں پر بھی اُتر کر دیکھو

اس افق پر نہ اگر جنّتِ موعودہ ملی
اُس افق تک بھی جو چاہو تو سفر کر دیکھو

کوئی ڈوبی ہُوئی کشتی ہے کہ ساحل کا نشاں
اپنی سوچوں کے سمندر سے اُبھر کر دیکھو

خود کو دیکھو مرے معیار کے آئینے میں
اک ذرا مجھ پہ یہ احسان بھی دھر کر دیکھو

موسمِ گُل ہے تو کردارِ چمن کیوں بدلے
آگ پھولوں کو تو شبنم کو شرر کر دیکھو

ہر زمانے میں بجھے تو نہیں رہتے خورشید
گردشو، آج مری شب کو سحر کر دیکھو

مارچ ۱۹۵۰ء

غزل

کیا بھروسا ہو کسی ہمدم کا
چاند اُبھرا تو اندھیرا چمکا

صبح کو راہ دکھانے کے لیے
دستِ گُل میں ہے دیا شبنم کا

مجھ کو ابرو، تجھے محراب پسند
سارا جھگڑا اسی نازک خم کا

حسن کی جستجوئے پیہم میں
ایک لمحہ بھی نہیں ماتم کا

ہُوئے اس دور میں فتوے جاری
کہ غزالوں کو جنوں سے رم کا

مجھ سے مر کر بھی نہ توڑا جائے
ہائے یہ نشہ زمیں کے نم کا

اب سیو چاکِ گریبانِ حیات
کہ تقاضا ہے یہی موسم کا

اپریل ۱۹۵۷ء

قطعہ

آنکھ کھل جاتی ہے جب رات کو سوتے سوتے
کتنی سُونی نظر آتی ہے گزرگاہِ حیات
ذہن و وجدان میں یوں فاصلے تن جاتے ہیں
شام کی بات بھی لگتی ہے بہت دُور کی بات

غزل

نیا فلک ہو رہا ہے پیدا، نئے ستارے نکل رہے ہیں
حیات کے تنگ دائرے میں گھرے ہوئے جسم جل رہے ہیں

یہاں ابھی پٹ رہا ہے ماضی، وہاں لٹا جا رہا ہے فردا
اِدھر فقط کٹ رہی ہیں گھڑیاں، وہاں زمانے بدل رہے ہیں

بکھر گئے ہیں جبینِ ایام پر نئی صبح کے اُجالے
افق سے شعلے نکل رہے ہیں، الاؤ راتوں کے جل رہے ہیں

جنھیں کسی دَور میں ڈبویا تلاطمِ بحرِ زندگی نے
تلاطمِ بحرِ زندگی سے وہی سفینے اُچھل رہے ہیں

اک ایک آنسو قرن کی لَو ہے، اک ایک پل رُوحِ عصر تو ہے
یہی نقوشِ حیات، صدیوں سے آبروئے غزل رہے ہیں

اپریل ۱۹۵۷ء

غزل

کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں
ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں

ذہن پر تنگ ہوا جب بھی اندھیرے کا حصار
چند یادوں کے دریچے ہیں، جو کام آئے ہیں

کون کہتا ہے، محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اُٹھا لائے ہیں

کتنے پل کے لیے وہ زینتِ آغوش رہے
کتنے برسوں کے مگر زخم نکھر آئے ہیں

گونج گونج اٹھتی ہے آوازِ شکستِ دل کی
جب بھی تارہ کوئی ٹوٹا ہے، وہ یاد آئے ہیں

داستانِ غمِ دنیا ہو کہ افسانۂ دل
وہی قصّے ہیں جو ہر دور نے دہرائے ہیں

سینۂ ارض میں بیدار ہے احساسِ جمال
جب سے فن کار ستاروں سے اُتر آئے ہیں

اے سحر، آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اُڑا
ہم نے جل جل کے ترے راستے چمکائے ہیں

اگست ۱۹۵۷ء

غزل

نہ محبت نہ صباحت فانی
یہ سمندر ہیں سدا طوفانی

تجھ کو چاہا تو تجھی کو چاہا
اِک یہ قصّہ نہ ہُوا طولانی

ہم ترے عکس پہ کیسے بھُولیں
آئنہ کس کا بنا ہے ثانی

ہم تری دھن میں تجھے چھوڑ گئے
ہم نے صورت نہ تری پہچانی

ہم سے پوچھے کوئی رونے کا سبب
اس قدر کون کرے قربانی

جیتے جیتے کسی قابل نہ رہے
قدر جینے کی نہ ہم نے جانی

کچھ سمجھتے تو کچھ آگے بڑھتے
اپنے پتے تو پڑی حیرانی

مینہ کے جھالوں نے تو پربت چاٹے
چلمنوں سے نہ رُکے گا پانی

اُن کو ٹوٹا تو اُجڑ جاؤ گے
جن کا سامان ہے بے سامانی

ستمبر ۱۹۵۷ء

غزل

اک دکھتا ذہن بھی ہوں اک سلگتا دل بھی ہوں
"اپنا ماضی بھی ہوں میں اور اپنا مستقبل بھی ہوں"[1]

میری دنیا پر اگر ظلمت مسلط ہے تو کیا
ابر میں لپٹی ہوئی شب کا مہِ کامل بھی ہوں

میں بظاہر اک بھنور ہوں چیختے جذبات کا
لیکن اس بپھرے ہوئے طوفان کا ساحل بھی ہوں

کفر کے افکار کی عظمت کا گو منکر نہیں
میں کسی قوت کے حسنِ ربط کا قائل بھی ہوں

زندگی تیرا ارادہ — موت تیرا فیصلہ
سوچتا ہوں تیرے ہوتے میں کسی قابل بھی ہوں

[1] PONGE

آبلوں پر جو حنا باندھے، مجھے یہ بھی بتائے
کیوں بایں درماندگی، وارفتۂ منزل بھی ہوں

شمع، میری چشمِ گریاں۔ گل، مرے پامال خواب
راندۂ محفل ہوں، محفل میں مگر شامل بھی ہوں

زندگی کا ذائقہ تھا ان لبوں کے لمس میں
فکر کا شاعر ہوں لیکن حسن کا گھائل بھی ہوں

ستمبر ۱۹۵۷ء

راستے

ریگِ صحرا سے نکل آنے کے بعد
جاگ اُٹھا ہے کتنی سمتوں کا شعور
راستوں سے کٹ گئے ہیں راستے

یوں گھرا طوفانِ بیداری میں ذہن
اور یوں ٹوٹے مرے خوابوں کے پھول
پتھروں سے پٹ گئے ہیں راستے

راستوں پر ہر طرف بکھرے ہوئے
یوں تو ہیں صدیوں کے قدموں کے نقوش
میتوں سے اَٹ گئے ہیں راستے

سوچا بھی جسم بن نہ رہ گیا
ہیں تو بس پل بھر کو ٹھٹکا تھا، مگر
دُور افق تک ہٹ گئے ہیں راستے

پھر وہی صحرائے ناپیدا کنار
پھر وہی سنسان ٹیلوں کا طواف
دائروں میں بٹ گئے ہیں راستے

اکتوبر ۱۹۵۷ء

غزل

ہم اپنے چراغ کیوں بجھائیں
دیتی رہے چاندنی صدائیں

یزداں کو زمیں پر بُلائیں
انسان کو آئینہ دکھائیں

وسعت تھا بہانہ بے پری کا
اُڑتے ہی سمٹ چلیں فضائیں

آدم کی رسائیوں سے ڈر کر
اسرارِ حیات تھرتھرائیں

لازم ہے کہ روحِ عصر پر سے
مانی کی کھُلی لٹیں ہٹائیں

طوفانِ خود آگہی کی زد میں
شاہوں کی قبائیں پھڑپھڑائیں

اِس دور کے ایک ایک پل میں
صدیوں کی جبینیں جھلملائیں

تصویرِ شمیمِ گل اُتاریں
یعنی ان کا سُراغ پائیں

یوں روئیں کہ ان کی انکھڑیاں بھی
اشکوں کی زباں میں مسکرائیں

یوں گائیں کہ جیسے نصف شب کو
تاروں کے حسین گنگنائیں

جب تک نہ سمجھ میں آئے انساں
ہم اپنی سمجھ میں خاک آئیں

اکتوبر ۱۹۵۷ء

گجر بجا دو

(اسپوتنک ۲ کی پرواز کے روز)

انگڑائیاں لے رہے ہیں تارے
اب رات کی چلمنیں اٹھا دو
اب تیرگی ہانپ رہی ہے
اب اس کو رہِ سحر دکھا دو
اونچے پیڑوں کی خامشی کو
جھونکوں کے سرود میں بہا دو
مشرق کا افق چمک اُٹھا ہے
مغرب کے غبار کو بتا دو
سورج کا اب انتظار کیسا
پو پھٹنے لگی۔ گجر بجا دو

اب اوج پہ ہے جمالِ انساں
اب چرخ کو آئینہ بنا دو
جو ہاتھ ترس گئے حنا کو
اب ان کو شفق کا رنگ لا دو
شبنم کی طرح جو رو رہے ہیں
تاروں کی طرح انہیں بنا دو

اُڑتے ہوئے پل نہیں تھمیں گے
اکڑی ہوئی گردنیں جھکا دو
ماضی کے مزار سے نکل کر
فردائے حیات کو صدا دو
اب حدِ نظر کی مشعلوں کو
تا حدِ خیال جگمگا دو

قرنوں سے تنی ہوئی خلا کو
انسان کا فیصلہ سنا دو
یہ فرش ہے عرش قدسیوں کا
اس وہم کو واقعہ بنا دو
اے جنتِ گم شدہ کے رازو
آدم ابھرا ہے، راستا دو
اے حوصلو، میرا ساتھ دو تم
اے ولولو، تم مجھے دعا دو

۳ نومبر ۱۹۵۸ء

غزل

وہ دھندلکا جسے سب حدِ نظر کہتے ہیں
اب تو انسان کی سے راہگزر کہتے ہیں

اپنا نعرہ بھی انا الحق ہے مگر فرق یہ ہے
ہم وہی بات باندازِ دگر کہتے ہیں

شیخ نے جس کو دیا نامۂ اعمال کا نام
ہم گنہگار اسے دامنِ تر کہتے ہیں

طاق پر جس کے کبھی ایک دیا تک نہ جلا
ہم تو اُس گھر کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں

کاش انساں کو شرر ہی کی چمک دے سکتے
زندگی کو جو فقط رقصِ شرر کہتے ہیں

رات جل اُٹھتی ہے جب شدتِ ظلمت سے ندیم
لوگ اُس وقفۂ ماتم کو سحر کہتے ہیں

بمبر ۱۹۵۷ء

حُسن

آج کس چیز سے بہلے مرا احساسِ جمال
کون چومے یہ خراشوں میں نہائے چہرے
گھاؤ چومے نہیں جاتے ہیں بھرے جاتے ہیں
ہائے اِس دورِ جراحت کی یہ محبوبائیں
مسکراتی ہیں کہ زخموں کے دہن کھولتی ہیں
وہ بصد ناز اک انداز سے جب بولتی ہیں
ہڈیاں بجتی ہیں وجدان کے شمشانوں میں
اور اُفق تا بہ اُفق گونجتا ہے ایک سوال
آج کس چیز سے بہلے مرا احساسِ جمال

جسم پر خون سے چپکا ہُوا پیراہن ہے
جس کو لوگوں نے دیا چُستیٔ ملبوس کا نام
ان کی رفتار میں برسات کے نالے کا خروش
دندناکر جیسے چپ چاپ اُتر جانا ہے
ان کے بازُو ہیں کہ چلتی ہُوئی تلواریں ہیں
جن کی دھاروں سے ہوا تک بھی نہیں کٹ سکتی
ان کی گردن کا تناؤ ہے کہ فطرت کا اصول
جو لچک جائے تو دنیا میں قیامت آجائے
اور لچکے تو زمانے کو پتہ بھی نہ چلے
ان کا معیارِ حیا ہے کہ ہر عرصۂ جنگ
اپنے ہی خون میں ڈُوبے ہُوئے سلطان کی ڈھال
آج کس چیز سے پہلے مرا احساسِ جمال

حسن ہی حسن ہے اب تک مرے فن کی پونجی
رُخِ معصوم پہ اُٹھے ہُوئے جذبات کا حُسن
جس طرح صبح کو احساسِ طلوعِ خورشید
آنکھوں آنکھوں میں تمناؤں کے اظہار کا حسن
ذہنِ شاعر میں کھلے جیسے نئے شعر کا پھُول
لمس کی آگ میں دہکے ہُوئے رخسار کا حُسن

وہ اٹکتے ہُوئے لہجے میں ادھوری باتیں
رنگ میں ڈوبا ہُوا جیسے مصوّر کا قلم
اپنی ہر جنبشِ موہوم پہ اتراتا ہے
آج یہ حسن کی تصویر ہے صرف ایک خیال
آج کس چیز سے پہلے مرا احساسِ جمال

حسن، تہذیب کی جاں حسن تمدّن کا نقیب
حسن، سرمایۂ آسودگیِ قلب و نظر
حسن ہے کعبۂ فن، حُسن ہے انساں کا وقار
حسن مٹ جائے تو اس کارگہِ عالم پر
ایک اک لمحہ صدی بن کے مسلط ہو جائے
کتنی صدیوں سے ہیں اس سوچ میں غلطاں ہوس کے لوگ
حسن کے خول سے کس طرح بہل جاتے ہیں
خود فریبی کی مسرت پہ یہ جینے والے
کیوں نہیں ڈھونڈتے کھلتے ہُوئے ہونٹوں میں نمی
پی چکی ہے جسے اک عمر سے ماحول کی دھوپ
کیوں نہیں دیکھتے آنکھوں میں جوانی کے چراغ
بجھ کے نرسمت دھواں چھوڑ گئیں جن کی لویں
کیوں نہیں سوجھتی چہروں پہ بکھرتی ہُوئی بھوک

لالہ اُبھرتے ہُوئے خیرات کے قدموں کے نشاں
ہائے اس دورِ جراحت کی یہ محبُوبائیں
میں انھیں دیکھ کے آنکھیں تو بجھو سکتا ہوں
لیکن احساس کی وہ آنچ نہیں پا سکتا
جس میں تپ کر ہی نکھر سکتی ہے رعنائی فن
وہ مری غیرتِ فن کے لیے معیار تو ہیں
حسن کی پیاس مگر اور بڑھا جاتی ہیں
افقِ فن پہ اڑا جاتی ہیں اس فکر کی دُھول
کیا یہی ہے مری پاکیزہ نگاہی کا مآل؟
کیا یہی ہے مری تہذیب کی فرمانبرداری؟

کیا یہی ہے مرے بے مثل تمدّن کا کمال؟
آج کس چیز سے پہلے مرا احساسِ جمال!

فروری ۱۹۵۵ء

جمیلہ

پا بہ زنجیر ہُوئی وقت کی رفتار کہاں!
جو کبھی کٹ نہ سکے، ایسی شبِ تار کہاں!
اے مرے جسم کو کانٹوں میں پرونے والے
ہے غلامی سے بھی بڑھ کر کوئی آزار کہاں!
میں نے جس راز کو سینے میں چھپا رکھا ہے
سرِ دربار نہ کھولا تو سرِ دار کہاں!
وہ جسے سایۂ سر بھی نہیں بہلا سکتا
اِس جنوں کو ہوسِ سایۂ دیوار کہاں!
سینچتے ہیں جنھیں خود اپنے لہو سے ہم لوگ
جا کے بکتے ہیں وہ گلشن سرِ بازار کہاں!
باندھے جاتے ہیں زبانوں پہ جہاں انگارے
وا ہُوا بھی تو ہمارا لبِ اظہار کہاں!
اے طلبگارِ صباحت! مرے گھر کی سرحد
ساحلِ تلزمِ خوں ہے، خطِ گلزار کہاں!
مجھ پہ اُٹھا ہُوا خنجر ترے دل میں اُترا
جا کے ٹوٹا ہے ستمگر، ترا پندار کہاں!

غزل

چلے بہشت سے ہم نکہتِ بہار کے ساتھ
شکست کھائی ہے لیکن بڑے وقار کے ساتھ

اب اس سے بڑھ کے ہو کیا ربطِ کائنات و حیات
فضائیں گونجی ہیں انسان کی پکار کے ساتھ

قدم قدم پہ اگر رُک رہے ہیں دشت میں ہم
تو کیا کریں، کہ تعارف ہے خار خار کے ساتھ

نہ جانے کون سا جادو تھا پیار کی رُت میں
بدلتے دیکھے ہیں موسم مزاجِ یار کے ساتھ

وہ احترامِ روایات ہو کہ مجبوری
نبھا رہے ہیں ستم ہائے روزگار کے ساتھ

جو بات ذہن میں آئی، زباں سے کہہ دیں گے
ندیمؔ جن کے مقدر بندھے ہیں دار کے ساتھ

مارچ ۱۹۵۸ء

ایشیا

ہر گئے دَور کا احتساب ایشیا، ہر نئے دَور کا اضطراب ایشیا
ظلمتِ شب کا دار الحساب ایشیا، صبحِ تہذیب کا آفتاب ایشیا

مدتوں تک بر و بحر کے حکمراں ایشیا ہی کے ٹکڑوں پہ پلتے رہے
یوں تو مغرب کی نظروں میں ہے آج بھی صرف اک خیمۂ بے طناب ایشیا

ابروؤں کے یہ خم، چتونوں کے یہ بل، صاحبوں کے یہ انداز ہیں بے محل
جو سوال اس کی غیرت سے پوچھے گئے، دے رہا ہے انہی کا جواب ایشیا

اے جنونِ مکافات کے شاکیو! یاد گزرے ہوئے وہ زمانے کرو
جب لہو اس کے دل سے نچڑتا رہا، اور رکھا تا رہا پیچ و تاب ایشیا

جلوتِ خاص میں ہے یہ کہرام کیوں، قصرِ عالی ہے لرزہ بر اندام کیوں
دیکھتا ہے خود اپنے کھنڈر میں اگر، عظمتِ آدمیت کا خواب ایشیا

گو بظاہر ابھی پیرہن چاک ہے، اس کے ہاتھوں میں میزانِ افلاک ہے
اب جو مانگو تو برگِ گلاب ایشیا، اور چھینو تو موجِ سراب ایشیا

جنسِ ناموسِ آدم کے سوداگرو! یہ صدی ہے مرے ایشیا کی صدی
چترِ شاہنشہی تھامنے کے عوض اب نہیں بیچتا خونِ ناب ایشیا

کل بھی تہذیب و اخلاق کی مشعلیں پرتوِ ایشیا سے فروزاں رہیں
برق و جوہر کے اس دورِ تاباں میں بھی نوعِ انساں کا عہدِ شباب ایشیا

اگست ۱۹۵۸ء

غزل

جیسے جیسے لوگ حق کے رازداں بنتے گئے
جو حقائق تھے وہ سب وہم و گماں بنتے گئے

جن گلوں کا حسن تھا قندیلِ شہراہِ حیات
ٹہنیوں سے ٹوٹ کر سنگِ گراں بنتے گئے

اوّل اوّل چند دھبے تھے وفورِ رنگ کے
شدّتِ تخلیقِ فن سے جو جہاں بنتے گئے

کچھ نہ کچھ پاتا بھی ہے انسان محرومی کے ساتھ
جن کے دل بجھتے گئے، برقِ تپاں بنتے گئے

ہر غبارِ کارواں سے کارواں بنتا گیا
کارواں یوں تو غبارِ کارواں بنتے گئے

تیرگی میں اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے
جانے والے پھوٹتی پَو کا سماں بنتے گئے

دُور سے دیکھا تو پلکوں تک کے سائے گِن لیے
جیسے جیسے تم قریب آئے، دھواں بنتے گئے

تم جب آئے، پھول بھی تحلیل ہو کر رہ گئے
جب گئے، موجِ ہوا تک پرنشاں بنتے گئے

اب فقط اک ٹیس میں سمٹی ہوئی ہے ان کی یاد
حلقۂ آغوش میں جو بے کراں بنتے گئے

اگست ۱۹۵۸ء

یاد

کتنا تاریک ہے اس شب کا گھنا سناٹا
چاند نکلا ہے مگر چاند کی ایک ایک کرن
نوکِ نشتر کی طرح دل میں اُتر جاتی ہے
اور جب حد سے گزر جاتی ہے سینے کی جلن
چاند بجھ جاتا ہے اور چاندنی مر جاتی ہے

دشتِ دل سے جو نکلتی ہے گزرگاہِ خیال
اپنے سینے پہ سجائے ہُوئے یادوں کے نشاں
آج اک زخم کی مانند اُبھر آئی ہے
ایک اک پل میں سمٹ آئی ہیں کتنی صدیاں
ایک اک سانس، مرا عالمِ تنہائی ہے

یوں تو ہر دور میں جذبات کی رُت آتی ہے
جب تری یاد سے بھر جاتا ہے پیمانۂ جاں
تیری آہٹ اُمڈ آتی ہے مرے خوابوں میں
سربسجدہ نظر آتا ہے مرا شعرِ جواں
تیرے پیکر کی دمکتی ہُوئی محرابوں میں

یوں تو کاٹے ہیں کڑے کوس تری فرقت کے
درد میں اب جو چمک ہے کبھی پہلے تو نہ تھی
آج تو تیرے خیالوں سے بھی آنچ آتی ہے
آج تو تیرا تصوّر بھی ہے گلدستۂ خار
آج تو یاد بھی اک ہُوک سی بن جاتی ہے

آج کی شب، کہیں وہ شب ہی نہ لوٹ آئی ہو
اُٹھ رہی جس میں نہ خود وقت کے قدموں کی صدا
جس میں اک عمر سے گُم ہے ترا پیمانِ وفا
جس میں جب چاند بھی اُبھرا تو دھواں پھیل گیا
یاس جس کے مری آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

اگست ۱۹۵۹ء

غزل

پھر یاد وہ مہ جمال آیا
ہے حدِ نظر تک اپنا سایا

تھا پاسِ ادب کہ اپنے دل میں
غم بھی ترا نام لے کے آیا

اس بزم میں تیرے واسطے سے
کوئی نہ لگا ہمیں پرایا

ہائے وہ سپردگی کی مستی
لُٹ کر بھی جبیں پہ بل نہ آیا

— ق —

خورشید بدست جستجو کی
لیکن تو کہیں نظر نہ آیا

ہم دل کا دیا جلا کے لائے
جب جا کے ترا سراغ پایا

— ق —

ہم ہیں ترا نقشِ خود نمائی
پندار ہمیں سے کیوں خدایا

تخلیقِ زمیں کا طنز مت کر
ہم نے ترا آسماں بنایا

اگست ۱۹۵۸ء

قطعہ

آدمی جوّ ہوا سے بھی نکل جائیں گے
چاند پر عظمتِ آدم کا عَلم لہرانے
قابلِ داد ہے یہ جرأتِ پرواز مگر
چاندنی کو بھی کہیں بانٹ نہ لیں دیوانے

ہم

پاداشِ حق میں زینتِ زنداں ہمیں تو ہیں
اِس تیرگی میں شمعِ فروزاں ہمیں تو ہیں

جس کا اُفق غروب کی لَو سے ہے تابناک
اے صبحِ نو، وہ شامِ غریباں ہمیں تو ہیں

صدیوں سے زندگی کے لباسِ حریر کا
جو چاک ہو رہا ہے، وہ داماں ہمیں تو ہیں

جو بھائیوں کی حرصِ تجارت میں بِک گئے
اے نظمِ نو، وہ یوسفِ کنعاں ہمیں تو ہیں

سکتے پھریں غبارِ سفر ہم کو اہلِ دہر
لیکن جبینِ دہر کی افشاں ہمیں تو ہیں

ہم جل رہے ہیں اپنی امنگوں کی آگ میں
اس جشنِ حریت کا چراغاں ہمیں تو ہیں

جس میں لہو کی بوند گراں تر ہے تخت سے
تھامے ہوئے وہ عدل کی میزاں ہمیں تو ہیں

آئینۂ صباحتِ انساں ہے جن کا فن
اے روحِ عصرِ نو وہ غزل خواں ہمیں تو ہیں

اگست ۱۹۵۸ء

ایک منظر

گنجان صنوبروں کے پیچھے
اک چاند، ہزار چاند بن کر
تاروں کی طرح بکھر گیا ہے
اس سیلِ جمال کے سہارے
ماضی کے نشیب بھر گئے ہیں
ویرانۂ جاں سنور گیا ہے

خوشبوئے حنا کا ایک پیکر
جلتی ہوئی انگلیوں کی لو سے
چھوتا ہے لبوں کے جب کنارے
گھل جاتے ہیں مصلحت کے اصنام
ہٹ جاتے ہیں قصرِ دل سے پہرے
آتے ہیں خیال پیارے پیارے

اک عمر کے بعد جب کھلی آنکھ
گمنام صنوبروں کے پیچھے
چاند آخرِ کار اُتر چکا ہے
گردش تو فضا میں گونجتی ہے
لمحوں کی تو چاپ سُن رہا ہوں
میرے لیے وقت مر چکا ہے

ستمبر ۱۹۵۸ء

قطعہ

تو میرا شعور، میرا وجدان
تو میرا یقین، میرا ایمان
میں تیری سپردگی کا معیار
تو میری پرستشوں کی پہچان

اکتوبر ۱۹۵۸ء

کھنڈر

غنچۂ دل جو کھلا بھی، تو سرِ شام کھلا
کون ظلمت میں نکلتا پئے نظارۂ گل
تو کہاں تھا کہ ترے دامنِ رنگیں کے لیے
ہاتھ پھیلائے رہی نکہتِ آوارۂ گل

گردشِ وقت کو سوجھی ہے نرالی تمثیل
جل رہی ہے مرے ماضی کے کھنڈر میں قندیل

اکتوبر ۱۹۵۸ء

غزل

لبِ خاموش سے افشا ہوگا
رازِ ہر رنگ میں رسوا ہوگا

دل کے صحرا میں چلی سرد ہوا
ابر گلزار پہ برسا ہوگا

تم نہیں تھے تو سرِ بامِ خیال
یاد کا کوئی ستارا ہوگا

کس توقع پہ کسی کو دیکھیں
کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہوگا

جس بھی فنکار کے شہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمھیں سوچا ہوگا

زینتِ حلقۂ آغوش بنو
دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا

ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو
در دچھکے گا تو پھر کیا ہوگا

آج کی رات بھی تنہا ہی کٹی
آج کا دن بھی اندھیرا ہوگا

کس قدر کرب سے چٹکی ہے کلی
شاخ سے گل کوئی ٹوٹا ہوگا

عمر بھر روئے فقط اس دھن میں
رات بھیگی تو اجالا ہوگا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

ستمبر ۱۹۵۸ء

قطعہ

ذرۂ خاک میں ادراک کی حدت بھر کر
اپنی تخلیق کے شعلوں میں نہ جل جاؤ کہیں
روشنی ہی سہی اس دور کی تہذیب کا اوج
موم کی طرح چمک کر نہ پگھل جاؤ کہیں

دعوت

اے میری پرستشوں کی حقدار
آ، میں ترے حسن کو نکھاروں
چہرے سے اُڑا کے گردِ ایام
آ، میں تری آرتی اُتاروں!
تُو میری زمیں بھی، آسماں بھی
میں تجھ کو کہاں کہاں پکاروں

اکتوبر ۱۹۵۸ء

قطعہ

فرشتے چاند سے ہٹ کر ہیں اس خیال میں گم
"کہاں سے چل کے یہ انساں کہاں تک آئے ہیں"
ابھی تو خیر سے تسخیرِ عرش باقی ہے
ابھی تو اہلِ زمیں، آسماں تک آئے ہیں

تضاد

کتنے کوسوں پہ جا بسی ہے تو
میں تجھے سوچ بھی نہیں سکتا

اتنا بے بس ہوں تیری سوچ کو میں
ذہن سے نوچ بھی نہیں سکتا

مجھ سے تو دُور بھی ہے پاس بھی ہے
اور مجھے یہ تضاد راس بھی ہے

اکتوبر ۱۹۵۸ء

قطعہ

مری شکست پہ اک پرتوِ جمال تو ہے
میں کیوں نہ عظمتِ افتادگی پہ اتراؤں
تجھی سے ہے مری آسودہ خاطری کا بھرم
ترے غموں کا خزانہ نہ چھنے، لوٹ جاؤں

قطعہ

دریا ہو، صبا ہو یا خیالات
ہر چیز تری طرف رواں ہے
اب تک نہ ہُوا مگر یہ معلوم
تو ہے تو کہاں نہیں، کہاں ہے

جَستیات

۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۸ء
↓
۲ر فروری ۱۹۵۹ء

THERE IS DELIGHT IN SINGING
THO' NONE HEAR
BESIDE THE SINGER.

W. S. Landor

ایک شعر

کتنی حساس خامشی ہے
سوچوں بھی تو رات گونجتی ہے

قطعہ

کنجِ زنداں میں پڑا سوچتا ہوں
کتنا دلچسپ نظارا ہوگا
یہ سلاخوں میں چمکتا ہُوا چاند
تیرے آنگن میں بھی نکلا ہوگا

دسمبر ۱۹۵۸ء

غزل

فاصلے کے معنی کا کیوں فریب کھاتے ہو
جتنے دور جاتے ہو، اتنے پاس آتے ہو

رات ٹوٹ پڑتی ہے جب سکوتِ زنداں پر
تم مرے خیالوں میں چھپ کے گنگناتے ہو

میری خلوتِ غم کے آہنی دریچوں پر
اپنی مسکراہٹ کی مشعلیں جلاتے ہو

جب تنی سلاخوں سے جھانکتی ہے تنہائی
دل کی طرح پہلو سے لگ کے بیٹھ جاتے ہو

تم مرے ارادوں کے ڈوبتے ستاروں کو
یاس کی خلاؤں میں راستہ دکھاتے ہو

کتنے یاد آتے ہو، پوچھتے جو کیوں مجھ سے
جتنا یاد کرتے ہو اُتنے یاد آتے ہو

دسمبر ۱۹۵۸ء

قطعہ

حد سے جب بڑھنے لگا تلخیٔ حالات کا زہر
ذائقے کو تری شیریں دہنی یاد آئی
جب بھی میں راہ سے بھٹکا، ترا پیکر چمکا
جب بھی رات آئی، تری سیم تنی یاد آئی

جنوری ۱۹۵۹ء

بارش

رات، بارش نے سقفِ زنداں پر
اس تسلسل کے ساتھ دستک دی
کہ اندھیرے کے انجماد کو بھی
یہ صدا کونج بن کے چیر گئی

ہر طرف پھیلتی، سمٹتی ہوئی
سرکشیدہ فصیل کی سوگند
میں تو سمجھا تھا، کنجِ زنداں میں
زیست کی ہیں تمام راہیں بند

آج لیکن حیات گاتی ہے
بند قفلوں کے اس دیار میں بھی
حسنِ فن کار کو پکارتا ہے!
سنگ و آہن کے اِس حصار میں بھی

—

دسمبر ۱۹۵۸ء

قطعہ

اپنے شاعر کے لیے زنداں میں
رات فردوس اُٹھا لاتی ہے
دامنِ شب سے لپٹ کر اکثر
تیری یادوں کی شمیم آتی ہے

جنوری ۱۹۵۹ء

غزل

مر کر بھی نہ ہوں گے رائگاں ہم
بن جائیں گے گردِ کارواں ہم

با وصفِ غمِ برہنہ پائی
ہیں تا بہ ابد رواں دواں ہم

ہم گونج ہیں سازِ ارتقا کی
گونجیں گے ابھی زماں زماں ہم

با وصفِ گمانِ بے زبانی
ہیں عصرِ جدید کی زباں ہم

کیوں پھیر میں آتے اہرمن کے
یزداں کے بھی ہیں مزاج داں ہم

نکلیں گے لحد سے پھول بن کر
پل بھر کے نہیں ہیں میہماں ہم

جنوری ۱۹۸۹ء

قطعہ

دن ختم ہو چکا مگر اک تازگی کرن
آئی کہیں سے اور مرے دل میں اُتر گئی
روشن نہیں تو تیرہ بھی کنجِ قفس نہیں
سورج تو چھپ گیا ہے مگر شب بھی مر گئی

جنوری ۱۹۸۹ء

قطعہ

زندگی یوں تو بڑے کرب سے کاٹی میں نے
جو گھڑی آئی ہے، پیغامِ طرب لائی ہے
زندہ رہنے کو مگر اور بھی جی چاہتا ہے
یاد جب بھی تری شیریں لب آئی ہے

جنوری ۱۹۵۹ء

ایک رات

کل نصف شب کی تیرگیوں میں ترا خیال
ماضی کے پھول کنجِ قفس میں سجا گیا
جس پر ٹھٹک گیا تھا مرا دل، ترا جمال
حالات کا وہ موڑ مجھے یاد آ گیا

کتنی لطیف تھی تری آنکھوں کی روشنی
کتنی بسیط تھی مرے جذبات کی فضا
اتنا حواس گیر تھا وہ لمحۂ جمیل
تیرے سوا خدا کی خدائی میں کچھ نہ تھا

برسوں کے بعد آج بھی اے مبدۂ حیات
تو میری دوست بھی ہے مری ہم سخن بھی ہے
تو میرا شعر، میرا فسانہ، مری زباں
تو میرا فن بھی ہے مرا موضوعِ فن بھی ہے

جب بھی میں اپنے ذہن سے چھوتا ہوں تیرا جسم
مٹھی میں دیکھتا ہوں طنابیں حیات کی
بوقفل کی کراہ کہ زنجیر کی پکار
کڑیاں ہیں اک شکستہ و درماندہ رات کی

جنوری ۱۹۵۹ء

قطعہ

میرے ویرانۂ احساس میں اک پھول کھلا
چارہ گر ڈھونڈنے نکلے ہیں مگر مرہمِ دل
میں تو یہ درد کی دولت انہیں چھونے بھی نہ دوں
تیری شدت کی قسم اے غمِ دل، اے غمِ دل

جنوری ۱۹۵۹ء

قطعہ

نہ چھیڑو مجھ سے باتیں خیر و شر کی
میں شاعر ہوں، بس اتنا جانتا ہوں
محبت کا اگر خالق خدا ہے
تو میں ایسے خدا کو مانتا ہوں

جنوری ۱۹۵۹ء

غزل

دامن کو نہ تار تار کر لے!
اِس رُت کو سدا بہار کر لے

حالات سے پنجہ آزما ہو
حالات کو سازگار کر لے

اے لذّتِ زندگی کے منکر
اِک بار کسی سے پیار کر لے

غمّاز ہے حسن آپ اپنا
جو رنگ بھی اختیار کر لے

زنداں پہ گمانِ فرشِ گُل ہے
جو چاہے مزاجِ یار کر لے

اب تو تری آبرو ہے مجھ سے
اب تو مرا اعتبار کر لے

جب تک میں ترا جمال دیکھوں
تو زخم مرے شمار کر لے

یا حسن کو بخش بے کناری
یا عشق کو ہمکنار کر لے

برسوں سے تری طرف رواں ہیں
ہمت ہے تو انتظار کر لے

جنوری ۱۹۵۹ء

قطعہ

قوتِ بازوئے انساں کے بغیر
خاک کا ڈھیر جمالِ زر و سیم
اتنی عظمت کا تصور بھی محال
جتنی انسان کی محنت ہے عظیم

جنوری ۱۹۵۹ء

اشعار

ہم دن کے پیامی ہیں مگر کشتۂ شب ہیں
اس حال میں بھی رونقِ عالم کا سبب ہیں

ظاہر میں ہم انسان ہیں مٹی کے کھلونے
باطن میں مگر تند عناصر کا غضب ہیں

ہیں حلقۂ زنجیر کا ہم خندۂ جاوید
زنداں میں بسائے ہُوئے اک شہرِ طرب ہیں

چٹکی ہُوئی یہ حسنِ گریزاں کی کلی ہے
یا شدّتِ جذبات سے کھلتے ہُوئے لب ہیں

آغوش میں مہکو گے دکھائی نہیں دو گے
تم نکہتِ گلزار ہو، ہم پردۂ شب ہیں

جنوری ۱۹۵۹ء

قطعہ

یا رب اِک عرض ہے گستاخانہ
(رہیں آباد ترے دیر و حرم)
مسکراتا ہوا دیکھا ہے تجھے
جب چٹانوں میں دھڑکتے ہیں صنم

جنوری ۱۹۵۹ء

غزل

پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک
انسان کی ہیں مملکتیں حدِ نظر تک

اک عمر سے ہر شب سرِ شہراہِ محبت
میں شمع کے انداز میں جلتا ہوں سحر تک

اک شب تو سحر تک مری آغوش میں چمکو
اک رات کی زلفیں تو پہنچنے دو کمر تک

لبریزِ جمال ایک کا دل، ایک کا پہلو
اتنا سا فقط فاصلہ ہے خیر سے شر تک

انسان نے تخلیق سے اب تک جو کیے طے
وہ مرحلے گزرے ہیں تری راہگزر تک

اک بار بگڑ کر جو تری بزم سے اُٹھوں
پھر آکے ترے پاس نہ لوں اپنی خبر تک

پندارِ محبت کے وہی لوگ امیں ہیں
پہنچے غمِ جاناں سے جو غمہائے دگر تک

آدم کی سُلگتی ہُوئی تاریخ رقم ہے
جبریل کے شہپر سے مرے دامنِ تر تک

اُبھرو بھی ندیمؔ اپنی شکستوں کے کھنڈر سے
ٹوٹے تو بلندی کو لپکتا ہے شرر تک

جنوری ۱۹۵۹ء —

قطعہ

تیری ہیبت ہے جہانگیر، مگر
تجھ سے تو میں، بخدا بہتر ہوں
اُس شہنشہ سے، جو نفرت بیچے
میں محبت کا گدا بہتر ہوں

جنوری ۱۹۵۹ء

قطعہ

جس شخص نے آدمی کے خون سے
اپنے چہرے کا رُوپ اُجالا
پتھر بن جائے، ہر ہو جائے
اس شخص کے ہاتھ کا نوالا

جنوری ۱۹۵۹ء

زمیں پہ وہ قیامت کا دور آیا ہے
کہ ہر بسیط حقیقت ہے جاں کنی سے دوچار
بساطِ ذہن پہ صرف ایک پھول کھلنے سے
ہٹی ہیں کتنی فصیلیں، گرے ہیں کتنے حصار
بجھی ہیں کتنے بڑے فلسفوں کی قندیلیں
مِلا ہے خاک میں کتنے علوم کا پندار
وہ آدمی جو نکالا گیا تھا جنّت سے
اُٹھا ہے بن کے قمر افگن و ستارہ شکار
ہیں لمحہ لمحہ کی زد میں صدی صدی کے اصول
کہ ہو رہی ہے نئی صبحِ آگہی بیدار

جنوری ۱۹۵۹ء

صبحِ آگہی

اک ایسے دور میں پیدا ہوئی ہے پود اپنی
کہ ایک پل میں زمانے گزرتے دیکھے ہیں
فنا کے دام میں اُلجھے ہوئے غریب انساں
نظامِ شمس پہ یلغار کرتے دیکھے ہیں
بصیرتوں پہ رہی برق بار جن کی چمک
وہ آفتاب خلاؤں میں مرتے دیکھے ہیں
جنھیں فقط دلِ آدم کی تھی فضا محبوب
وہ زخم سینۂ مہ پر بکھرتے دیکھے ہیں
جو نصف شب کو سُنی ہے صدائے پائے سحر
تو دوپہر کو ستارے اُبھرتے دیکھے ہیں

قطعہ

یہ ہجر و وصال کے معمّے
اِک تیرے سوا کوئی نہ جانے
صدیوں میں بس ایک رات گزری
اِک پَل میں کٹے کئی زمانے

جنوری ۱۹۵۹ء

غزل

تیری محفل بھی مداوا نہیں تنہائی کا
کتنا چرچا تھا تری انجمن آرائی کا

داغِ دل نقش ہے اک لالۂ صحرائی کا
یہ اثاثہ ہے مری بادیہ پیمائی کا

جب بھی دیکھا ہے تجھے، عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہُوا تیری شناسائی کا

وہ ترے جسم کی قوسیں ہوں کہ محرابِ حرم
ہر حقیقت میں ملا خم تری انگڑائی کا

افقِ ذہن پہ چمکا ترا پیمانِ وصال
چاند نکلا ہے مرے عالمِ تنہائی کا

بھری دنیا میں فقط مجھ سے نگاہیں نہ چُرا
عشق پر بس نہ چلے گا تری دانائی کا

ہر نئی بزم تری یاد کا ماحول بنی
میں نے یہ رنگ بھی دیکھا تری یکتائی کا

نالہ آتا ہے جو لب پر تو غزل بنتا ہے
میرے فن پر بھی ہے پرتو تری رعنائی کا

جنوری ۱۹۵۹ء

قطعہ

دادِ حشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

جنوری ۱۹۵۹ء

ایک شعر

ہر زخم، زبان بن رہا ہے
اب دردِ حیات میں کمی ہے

۲ر فروری ۱۹۵۹ء

رہائی:

۲ - فروری ۱۹۵۹ء

پسِ پردہ

کیسا بپھرا ہُوا سناٹا ہے
ہانپتے ہونکتے جھونکوں کی قسم
تیرہ و تار افق پر اشجار
رقص کرتے ہُوئے جنّات کے خم
گڑ گئی سینۂ آفاق میں رات
کٹ گئے وقت کے بے چین قدم
چمک اے چودھویں شب کے مہتاب
عالم افروز ہیں تیرے دم خم

چاند کہتا ہے پسِ پردۂ ابر
کون ظلمات کی دلدل میں پھنسے
میں کوئی لالۂ صحرا تو نہیں
کون سنسان فضا میں چمکے
کون آسیب سے رشتہ باندھے
کون ٹوٹی ہوئی قبروں پہ ہنسے
کیوں مرا خونِ جگر مفت بہے
چاندنی کیوں مری بیکار لٹے

ذہن کہتا ہے پسِ پردۂ کرب
ایک پل پر نہیں صدیوں کا مدار
زندگی جھیل بھی ہے، چشمہ بھی
اور چشمے نہیں تھمتے زنہار
آدمی پھول بھی ہے، کانٹا بھی
اور کانٹے کا لچکنا دشوار
ڈھال فولاد بنے یا تہذیب
خالی جاتا نہیں تاریخ کا وار"

سوچتا ہوں میں پسِ پردۂ شب
گنگناتے ہوئے جھونکوں کی قسم
خواب آلود افق پر اشجار
رقص کرتی ہوئی لیلاؤں کے خم
سینۂ ارض کو۔ بوسوں کے گلاب
دے گئے۔ وقت کے بے چین قدم
ابر پر چاند کی میت ابھری
صبح نے لوٹ لیے سب دم خم

اپریل ۱۹۵۹ء

قطعہ

مانا، کہ طویل فاصلوں پر
برسوں کے غبار چھا گئے ہیں
محرومیِ مشترک سے لیکن
ہم کتنے قریب آ گئے ہیں

اکتوبر ۱۹۵۸ء

ایک جھونکا

سرد جھونکا کوئی آیا کہ بگولا گزرا۔
آدمی ہو کہ لبِ جُو کا سرافراز درخت
اپنی نظروں میں تو قدموں سے اکھڑتا گزرا
سر جھکائے ہوئے، سوئے ہوئے کل یوں چونکے
جیسے بھونچال میں جاگ اُٹھتے ہیں پیڑوں پہ پرند
اور چلاتے ہیں یوں گونجتی خاموشی میں
جیسے بستی سے بپھرتا ہوا دریا گزرا

دھوپ جھلا کے نکلتی ہے تو ابر آتا ہے
مینہ برستا ہے تو بڑھ جاتا ہے ماحول کا حبس
شب کی تو بات ہی کچھ اور ہے، آخر شب ہے
دن کو ہر چیز کا ملبوس اُتر جاتا ہے
میری تہذیب کا پردہ، مری قدروں کا نقاب
سانپ کی کینچلی بن کر، کسی چوراہے پر
آدھے جاگے ہوئے انسان کو دہلاتا ہے

کن تضادوں میں تپاں ہے مری پروازِ خیال
دستِ تخلیق کی زنجیرِ طلائی کی قسم
ابھی انسان سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال
ایک کہتا ہے غزل، ایک بناتا ہے بم
ایک کو دل بھی بہت، ایک کو آفاق بھی کم
اور پسِ ظلمتِ تہذیب، کئی صدیوں سے
چاند بننے کو بھٹکتے ہیں محبت کے ہلال

مئی ۱۹۵۹ء

غزل

کچھ دل سے نگاہ بدگماں ہے
کچھ منظرِ یاد پر دھواں ہے

جب تک نہ جلے چراغ دل کا
ہر شے کا جمال رائگاں ہے

تو میرا شعور، میرا وجدان
تو میرا وجود، میری جاں ہے

تو اتنا قریب ہے، کہ تجھ سے
میں پوچھ رہا ہوں، تو کہاں ہے

شاہد ہے مری وفا شعاری
انسان بلا کا سخت جاں ہے

ٹوٹی ہوئی شاخ ہو کہ دل ہو
ہر زخم، بہار کا نشاں ہے

اک جست کا فاصلہ ہے، شر تک
لیکن ترا پیار درمیاں ہے

میں عشق ہوں اور جاوداں ہوں
تو حسن ہے اور بے کراں ہے

تُو ہو کہ ندیم ہو کہ یزداں
جو کچھ بھی ہے، زیرِ آسماں ہے

جون ۱۹۵۹ء

غزل

میں ہُوں، یا تُو ہے، خود اپنے سے گریزاں جیسے
میرے آگے کوئی سایہ ہے خراماں جیسے

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھُول یوں کھلتے ہیں، جلتا ہے گلستاں جیسے

یوں تری یاد سے ہوتا ہے اجالا دل میں
چاندنی میں چمک اُٹھتا ہے بیاباں جیسے

دل میں روشن ہیں ابھی تک ترے وعدوں کے چراغ
ٹوٹتی رات کے تارے ہوں فروزاں جیسے

تجھے پانے کی تمنا، تجھے کھونے کا یقیں
تیرے گیسو مرے ماحول میں غلطاں جیسے

وقت بدلا، پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا
آندھیوں میں سرِ کہسار چراغاں جیسے

اشک آنکھوں میں چمکتے ہیں تبسم بن کر
آگیا ہاتھ ترا گوشۂ داماں جیسے

تجھ سے مل کر بھی تمنا ہے کہ تجھ سے ملتا
پیار کے بعد بھی لب رہتے ہیں لرزاں جیسے

میرے اشعار میں یوں فن ہیں اسرار ترے
پردۂ ساز میں آواز ہو پنہاں جیسے

بھری دنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا
مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے

غمِ جاناں، غمِ دوراں کی طرف یوں آیا
جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

عصرِ حاضر کو سناتا ہوں اس انداز میں شعر
موسمِ گل ہو مزاروں پہ گل افشاں جیسے

زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اس طرح ندیمؔ
سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے

جون ۱۹۵۰ء

خشک پتّے

جب ذرا تیز ہوا آتی ہے
خشک پتّوں کی صدا آتی ہے
خشک پتّے۔ مرے عمروں کے رفیق
خشک پتّے۔ مری تنہائی کے پھول
خشک پتّے۔ مری غیرت کے اصول

گوشۂ گلشنِ ویراں کا سکوت
اتنا پُرہول ہے۔ جیسے اک لاش
شب کی باہوں میں لٹک کر رہ جائے
چاندنی اس کا کفن ہو گویا
چار جانب سے اُبلتی ہُوئی موت
سانس کو روک کے چلتی ہُوئی موت

یک بیک ذہن پہ دستک دے کر
خشک پتّوں نے پکارا مجھ کو
"باغ اجڑا ہو کہ آباد رہے
ذہن اس فکر سے آزاد رہے
کہ یہاں اب نہ چلیں گے جھونکے
اور جو چیز جہاں رکھی ہے
حشر کے دن بھی وہیں دیکھو گے"

فصلِ گُل ہو کہ خزاں کی رُت ہو
جب ذرا تیز ہوا آتی ہے
وقت کی آہٹیں گونج اٹھتی ہیں
خشک پتّوں کی صدا آتی ہے
"ہم ترے پاس بھی ہیں، ساتھ بھی ہیں
ہم وہی ہیں۔ ترے عمروں کے رفیق
ہم وہی ہیں۔ تری تنہائی کے پھول
ہم وہی ہیں۔ تری غیرت کے اصول"

اکتوبر ۱۹۵۰ء

غزل

شانِ عطا کو، تیری عطا کی خبر نہ ہو
یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو

چپ ہوں کہ چپ کی داد پہ ایمان ہے مرا
مانگوں دعا جو میرے خدا کو خبر نہ ہو

کر شوق سے شکایتِ محرومیٔ وفا
لیکن مرے غرورِ وفا کو خبر نہ ہو

اک روز اس طرح بھی مرے بازوؤں میں آ
میرے ادب کو، تیری حیا کو خبر نہ ہو

ایسی بھی کیا بلندیٔ معیارِ فصلِ گُل
یوں گُل کھلیں کہ موجِ صبا کو خبر نہ ہو

آزادیٔ خطا بھی تو ہے آدمی کی شان
بھٹکوں تو میرے راہنما کو خبر نہ ہو

نذرانۂ حیات سلیقے سے کر قبول
اے موت، میرے ذوقِ بقا کو خبر نہ ہو

نومبر ۱۹۵۹ء

قطعہ

ایسے خورشید سے خالی ہے خلا
جو نکل آئے تو سائے نہ ڈھلیں
سورج اُبھرا تھا مگر ڈوب گیا
آؤ خود اپنی تمازت میں جلیں

نومبر ۱۹۵۹ء

غزل

یوں تو اس جلوہ گہِ حُسن میں کیا کیا دیکھا
جب تجھے دیکھ چکے، کوئی نہ تجھ سا دیکھا
جب تری دُھن میں کہیں لالۂ صحرا دیکھا
ہم یہ سمجھے کہ ترا نقشِ کفِ پا دیکھا
جب بھی سوچا کہ ترے شہر کے اُبھرے ہیں نقوش
اِک بگولا سا رواں بر سرِ صحرا دیکھا
تارے ٹوٹے تو فضا میں تری آہٹ گونجی
چاند نکلا تو ترا چہرۂ زیبا دیکھا
شہرِ غیب [illegible] اپنی خوشی کب کم ہے
ہم نے دیکھا تجھے [illegible] انجمن آرا دیکھا
ہم کو ٹھکرا کے کچھ ایسے تُرنے تیور بدلے
جب سرِ بزم بھی دیکھا تجھے تنہا دیکھا

ہم تو سمجھے تھے، قیامت ہے فراقِ محبوب
تجھ سے مل کر بھی مگر حشر ہی برپا دیکھا

صبح جب دھوپ کے چشمے سے نہا کر نکلی
ہم نے، آئینہ بہ دل، تیرا سراپا دیکھا

بجلیاں اب تو ترے ابرِ کرم کی برسیں
عمر بھر اپنے سلگنے کا تماشا دیکھا

ہم جو بھٹکے بھی تو کس شانِ وفا سے بھٹکے
ہم نے ہر لغزشِ پا میں ترا ایما دیکھا

ہم، بایں تیرہ نصیبی، نہ بنے تیرہ نظر
ہم نے ہر رات کی چتون میں ستارا دیکھا

تیری قدرت کی سیاست نہ سمجھ میں آئی
حرم و دیر کو ہمدوش ہی یکجا دیکھا

آنکھ کھولی، تو جہاں کانِ جواہر تھا ندیم
ہاتھ پھیلائے تو ہر چیز کو عنقا دیکھا

دسمبر ۱۹۵۹ء

نیا سال

(عالمی حالات کے پس منظر میں)

رات کی اُڑتی ہوئی راکھ سے بوجھل ہے نسیم
یوں عصا ٹیک کے چلتی ہے کہ رحم آتا ہے
سانس لیتی ہے درختوں کا سہارا لے کر
اور جب اس کے لبادے سے لپٹ کر، کوئی
پتّہ گرتا ہے تو پتھر سا لڑھک جاتا ہے

شاخیں۔ ہاتھوں میں لیے کتنی ادھوری کلیاں
مانگتی ہیں فقط اِک نرم سی جنبش کی دُعا

ایسا چپ چاپ ہے سنولائی ہوئی صبح میں شہر
جیسے معبد کسی مُرجھائے ہوئے مذہب کا

سر پہ اپنی ہی شکستوں کو اُٹھائے ہوئے لوگ
اِک دوراہے پہ۔ گروہوں میں کھڑے ہیں تنہا

یک بیک فاصلے تانبے کی طرح بجنے لگے
قدم اُٹھتے ہیں تو ذرّے بھی صدا دیتے ہیں
"درد کے پیرہنِ چاک سے جھانکو تو ذرا
مردہ سورج پہ لٹکتے ہوئے میلے بادل
کسی طوفان کی آمد کا پتا دیتے ہیں"

یکم جنوری ۱۹۶۰ء

قطعہ

ممکن ہے، فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک
جو کچھ بھی ہے، آدم کا نشانِ کفِ پا ہو
ممکن ہے، کہ جنّت کی بلندی سے اُتر کر
انسان کی عظمت میں اضافہ ہی ہُوا ہو

جنوری ۱۹۶۰ء

غزل

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

سب حجاباتِ نظر دل کے نہ دکھنے تک تھے
درد چمکا تو اندھیرا ابھی نہ رہنے پایا

جانے کیوں اب شبِ ہجراں پہ بھی پیار آتا ہے
تیرا غم میری محبت کو کہاں لے آیا

میں تری بزم سے اٹھ کر بھی تری بزم میں ہوں
میں نے جب خود کو گنوایا تو تجھے اپنایا

رات کا شکر کر اے دوست کہ دن ہوتے ہی
تیرے پیکر سے اچٹ آئے گا تیرا سایا

ابر کے چاک سے جب رات ستارے جھانکے
اے مرے بھولنے والے تو بہت یاد آیا

اشک آنکھوں میں جب آئے چمک اٹھیں صدیاں
یوں کہ جس دور کو دیکھا اسے گریاں پایا

جب بھی دیکھوں کوئی شہ پارۂ فن سوچتا ہوں
کتنے لوگوں نے مرا قصۂ غم دہرایا

خشک شاخوں پہ نمو کے یہ نگینے کیا ہیں
زندگی ہے اگر اک پیڑ کی ڈھلتی چھایا

بیچ دوں کیوں اسے اک نانِ جویں کے بدلے
میں نے جس دل کے لیے ایک جہاں ٹھکرایا

اس توقع پہ کہ شاید کبھی انساں بدلے
ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اکسایا

اپریل ۱۹۶۰ء

یاد کا چاند

کل سویرا ہے، تجھ سے ملتا جلتا خواب نظر آیا
یوں میرے ویرانۂ شب میں یاد کا چاند ابھر آیا
آنکھیں جیسے ٹوٹتی نیندیں، کچھ خوابیدہ، کچھ بیدار
پلکوں میں وہی اٹکا اٹکا گزرے ہوئے لمحوں کا خمار
گالوں پر بل کھاتی لٹ کچھ اس ڈھب سے لہرائی ہوئی
جیسے اک آوارہ بدلی چاند کی زد میں آئی ہوئی
ہونٹ، چٹکتی کلیاں جو معصوم بھی تھیں، پُرکار بھی تھیں
ظاہر میں نمناک، مگر باطن میں آتش بار بھی تھیں
نیلی نیلی رگیں بھی وہی تھیں گردن کے مرمر میں رواں
جسم کی ساری تراشش وہی تھی، جیسے میرا شعرِ جواں
میرا ماضی چار طرف سے گھیر کر مجھے بلانے لگا
اک اک پل چلا چلا کر شورِ حشر اٹھانے لگا
میں نے پلٹ کر دیکھا، لیکن سارا کھیل خیالی تھا
جسم کا حسن وہی تھا لیکن پیار کے حسن سے خالی تھا

مئی ۱۹۶۰ء

غزل

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے

کوہِ غم پر سے جو دیکھوں، تو مجھے
دشت، آغوشِ فنا لگتا ہے

سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے، خفا لگتا ہے

موسمِ گل میں سرِ شاخِ گلاب
شعلہ بھڑکے تو بجا لگتا ہے

مسکراتا ہے جو اس عالم میں
بخدا، مجھ کو خدا لگتا ہے

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے

اُن سے مل کر بھی نہ کافور ہُوا
درد یہ سب سے جُدا لگتا ہے

نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہُوں، گِلہ لگتا ہے

اِس قدر تُند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا ہے

مئی ۱۹۶۰ء

غزل

کتنے نالے تھے جو شرمندۂ تاثیر ہُوئے
ریگِ زرّیں پہ کبھی قصرِ تعمیر ہُوئے

جن کو شاخوں سے اُڑا لے گئیں امواجِ صبا
وہی گل، خاکِ چمن کے لیے اکسیر ہوئے

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی ہے پَو بھی
کبھی دنیا میں اندھیرے نہ جہانگیر ہُوئے

ہم اصولوں کے حصاروں میں چھپے لاکھ، مگر
اک نگاہِ غلط انداز سے تسخیر ہُوئے

وہی آواز کی قوسیں، وہی تانوں کے خطوط
چند نغمے تھے جو مل کر تری تصویر ہُوئے

ایک انداز تو ہے بے سروسامانی کا
ہم تری دُھن میں ترے غم سے بغل گیر ہوئے

ایک امیدِ ملاقات نے مرنے نہ دیا
تیرے پیماں مری سانسوں کے عناں گیر ہوئے

تجھ سے مل کر تجھے پا لینے کی حسرت جاگی
کچھ نئے خواب، ترے خواب کی تعبیر ہوئے

اک خلا طے ہوئی ایک اور خلا کی حد پہ
اپنے شہپر نہ ہوئے حلقۂ زنجیر ہوئے

ہم نے ہر شعر میں تصویرِ جراحت کھینچی
لوگ وارفتۂ رنگینیٔ تحریر ہوئے

جون ۱۹۷۰ء

اے مشیت تری قوت کو سلام

تیری مٹھی میں ہے مہر و مہ و انجم کا نظام
ارض و مریخ ترے دم سے ہیں گردش میں مدام
مجھ سے کافر کو بھی کب ہے تری عظمت میں کلام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

نہ ازل ہے کوئی نقطہ، نہ ابد کوئی لکیر
وقت بھی ہے ترے پیکانِ بقا کا نخچیر
ان حصاروں سے ہے اُونچا ترا معیارِ دوام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

کتنی قرنوں سے خلا میں ہے زمیں آوارہ
وقت کی دھول سے آزاد ہے یہ سیارہ
وہی خوابیدہ لیالی، وہی بیدار ایام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

وہی جذبات کے بندھن، وہی رشتے، وہی جال
وہی معمولِ محبت، وہی کردارِ جمال
وہی اُمڈی ہوئی آنکھیں، وہی حسنِ سرِ بام
اے مشیت اتری قوت کو سلام

پھول کھلتے ہیں اسی طرح گلستانوں میں
اسی نرمی سے ہوا چلتی ہے میدانوں میں
سرِ ساحل ہے وہی موج کا اندازِ خرام
اے مشیت اتری قوت کو سلام

اب بھی انسان ہے اسباب و نتائج کا اسیر
قصر کے سائے میں اب تک ہے وہی جمِ غفیر
وہی جینا ہے مصیبت۔ وہی مرنا ہے حرام
اے مشیت اتری قوت کو سلام

جنوری ۱۹۶۰ء

غزل

کون جگ میں ترا ہمسر دیکھے
کوئی اس دھند میں کیونکر دیکھے

عمر بھر ایک ترا دھیان رہا
یوں تو مہر و مہ و اختر دیکھے

آنکھ صرف آنکھ ہے، آئینہ نہیں
جو تجھے سامنے پاکر دیکھے

تیرے جاتے ہی یہ محسوس ہوا
عمر گزری تجھے پل بھر دیکھے

دُور ہی دور سلگنے والے
کاش تو پاس بھی آکر دیکھے

ہم تو تھے جس کے تاریخ نگار
ہم نے قیصر نہ سکندر دیکھے

لوگ ماضی کے دھوئیں میں ڈوبے
ہم نے گیسوئے معنبر دیکھے

نظر آئے انھیں سبزے میں بھی سانپ
ہم نے صحرا بھی ثمر ور دیکھے

انھیں جسموں سے بتوں نے جھانکا
ہم نے پتھر میں بھی پیکر دیکھے

انھیں دریاؤں نے پیاسا مارا
ہم نے آنکھوں میں سمندر دیکھے

کون غالبؔ سا سخن ور ہے ندیمؔ
سیکڑوں یوں تو ہنر ور دیکھے

جولائی - ۱۹۷۰ء

نذرِ فن کارانِ وطن

کیوں تیرگیِ ذہن کا الزام خدا پر
تو خود ہی دھواں بن کے مسلط ہے فضا پر

خوابوں کی یہ باتیں ہیں کہ جب ظلمتِ شب میں
مشعل کا گماں تھا تری ایک ایک ادا پر

جب نشۂ تخلیق میں تو نے کبھی دیکھا
پھولوں کے سفینے تھے رواں موجِ صبا پر

اب تک ہیں مجھے تیرے خیالوں کے سفر یاد
جلتے تھے دیے جب ترے نقشِ کفِ پا پر

دریوزۂ جذبات کے باوصف : بظاہر
صرف اپنی لکیریں تھیں ترے دستِ دعا پر

یہ ذہن کے فردوس ترے فن کے نشاں تھے
یہ بھی کبھی سوچا کہ قدم تیرے کہاں تھے

اس سان سے بدلا ہے چلن عصرِ رواں کا
اب چاند بھی اک پھول ہے گلزارِ جہاں کا
تقدیر کے رو کے بھی ابد تک نہ رُکے گا
انساں ہے اب اک تیرِ مشیت کی کماں کا
اب فاصلے کچھ ہیں تو روایاتِ کہن ہیں
اب حدِ نظر پر بھی گماں ہے رگِ جاں کا
اس درجہ بصارت کے افق پھیل گئے ہیں
تاروں پہ بھی دھوکا ہے رُخِ برق وشاں کا
وہ دل کا پھپھولا ہو، کہ داغِ رُخِ خورشید
محتاج ہے فن کار کی چشمِ نگراں کا
گو وقت، شب و روز کے چکر میں رواں ہے
جب بھی نظر اُٹھتی ہے، گجر دم کا سماں ہے

رہ رہ کے مجھے اب یہ خیال آنے لگا ہے
صدیوں کے اصولوں کو زوال آنے لگا ہے
مرمر کے دریچوں پہ ہیں ظلمات کے پہرے
مٹی کے گھروندوں پہ جمال آنے لگا ہے

ہے دھول سے لبریز اُدھر ساغرِ جمشید
گردش میں اِدھر جامِ سفال آنے لگا ہے
بہتر ہے کہ انجم حدِ امکاں سے نکل جائیں
انساں کو مقدر پہ جلال آنے لگا ہے
کیا خلد کی میراث پہ کچھ حق نہیں میرا
آدم کے لبوں پر یہ سوال آنے لگا ہے
سوئی ہوئی کس دُھن میں تری غیرتِ فن ہے
جاگا ہُوا انساں بھی تو موضوعِ سخن ہے

اگست ۱۹۶۰ء

شامِ فراق

بس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نور
تک رہا ہے ستارے کی طرح زخمِ جگر
چمک رہے ہیں جھروکے مرے خیالوں کے
مری شکست کے چپ چاپ رہگزاروں پر
لپک رہے ہیں تصور، پری جمالوں کے
ہر ایک گزرا ہوا پل، کروڑوں روپ لیے
غبارِ وقت سے یوں جھانکنے لگا، جیسے
امڈ رہے ہیں افق سے پرے غزالوں کے

وہ روشنی ہے کہ ہر چیز ہے برہنہ بدن
وہ ایک فرد کا غم ہو کہ روحِ عصر کا درد
جو رازِ دفن رہے مدتوں، قرن بہ قرن
کچھ ایسے فاش ہوئے جا رہے ہیں پے در پے
کسی شہید کی نظروں میں جس طرح ٹوٹے
غرورِ جبر و تشدد، طلسمِ دار و رسن
کلیم ہوں، مری شامِ فراق میرا طور
برس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نور

ستمبر ۱۹۶۰ء

توحید

دہر کو تشنگیِ نازِ بتاں ہے اب تک
تو مری یاد میں کیوں سوختہ جاں ہے اب تک

تجھ کو اک مجھ سے، فقط مجھ سے محبت کیوں ہے
یہ تو میں مانتا ہوں، تو مری جاں ہے اب تک

کیوں مسرت سے ہے محروم تری شانِ جمال
کیوں مرا غم ترے چہرے سے عیاں ہے اب تک

میرا معیارِ وفا ہے ترے دم سے قائم
ہر گھڑی تو مری جانب نگراں ہے اب تک

میں محبت میں بھی توحید کا قائل ہوں، مگر
ظلم ہے حسن پہ پابندیٔ آدابِ وفا
حسن ہے صحنِ چمن، عشق ہے صحرائے بسیط
جس سے کترا کے نکل جاتی ہیں امواجِ صبا
اس کے باوصف بھرے شہر کی تنہائی میں
آج بھی میں نے سُنی ہے تری آہوں کی صدا
رسن و رسم سے جکڑی ہوئی اس دنیا میں
حسن بھی عشق کرے گا، مجھے معلوم نہ تھا

اکتوبر ۱۹۶۰ء

تہذیب

پھر مرتب ہُوئے تہذیب و ثقافت کے اصول
دُور تک پھیل گئے ریگِ رواں کے ٹیلے

آج کی بات نہ کر، آج تو جو کچھ ہے، سو ہے
میں تو یہ سوچتا ہوں، کل اسی ٹیلے کی ببول
اَن گنت نقرئی خاروں میں پروئے ہُوئے پھُول
جانے اس دشت کے کس گوشۂ تنہائی میں
کسی ٹیلے کی منوں ریت کے نیچے دب کر
جب کوئی راہ نہ پائے گی تو چلائے گی
'ہائے میں! ہائے مرے پھُول وہ پیلے پیلے"

پھر مرتب ہُوئے تہذیب و ثقافت کے اصول
دُور تک پھیل گئے ریگِ رواں کے ٹیلے

اکتوبر ۱۹۶۰ء

قطعہ

احساسِ جمال و ذوقِ فن کے
اِس درجہ بدل گئے قرینے
جل جل کے بجھے گہر تہِ آب
ساحل سے بندھے رہے سفینے

سچ

سقراط سے گلیلیو تک، سچ کے زہرے
کتنی عقیدتوں کے جگر چاک ہو گئے
کتنے عظیم قوت و حشمت کے دیوتا
سیلِ شعور کے خس و خاشاک ہو گئے

سچ کو بسا کے دل میں، سفر پر چلا تھا میں
اک شانِ بے نیاز سے، بساطِ حیات پر
کوسوں تک ایک بھی مجھے انساں نظر نہ آیا
کتنا غرور تھا مجھے عرفانِ ذات پر

اُلجھا رہا خیال میں طوفانِ زلفِ یار
سقراط یاد آتا رہا بات بات پر
روندے کچھ ایسے اپنی جبلّت کے بتکدے
محمود جیسے ٹوٹ پڑے سومنات پر
جب میں خودی کی آخری حد پر پہنچ گیا
خود اپنا سایہ پھیل گیا کائنات پر

اب سوچتا ہوں اپنی تھکن کے غبار میں
سچ زہر ہی سہی مگر اس میں نشہ بھی ہے
سچ کے کھنڈر پہ چڑھ کے صدائے ہا ہوں میں
دُنیا میں کیا کوئی مجھے پہچانتا بھی ہے؟

اکتوبر ۱۹۶۰ء

غزل

یہاں سے دُور نہ ہوگا دیارِ موسمِ گُل
شفق سے جھانک رہا ہے غبارِ موسمِ گُل

وہی گلوں سا تبسّم، وہی کلی سا شباب
رُخِ نگار ہے آئینہ دارِ موسمِ گُل

چمن کی طرح مہکتا ہے اب بھی داغِ فراق
تمہاری یاد رہی یادگارِ موسمِ گُل

ملا نہ ایک بھی گُل، ورنہ دیکھ سکتا ہوں
غبارِ گُل میں رُخِ تابدارِ موسمِ گُل

شرر جو سنگ سے ٹوٹے تو پھُول بن کے کھِلے
جنوں میں بھی نہ اُٹھا اعتبارِ موسمِ گُل

خزاں دلوں میں جڑیں چھوڑنے کی دُھن میں ہے
کہاں گیا مرا پروردگارِ موسمِ گُل

اٹھو، کہ اُٹھ کے سجائیں اک ایک خار پہ پھُول
چلو، کہ چل کے بڑھائیں وقارِ موسمِ گُل

بنائیے سرِ راہِ بہار، میرا مزار
مری سرشت میں ہے انتظارِ موسمِ گُل

ندیمؔ، اپنی بہار آفریں غزل کی قسم
بدل سکیں گے نہ لیل و نہارِ موسمِ گُل

نومبر ۱۹۶۰ء

غزل

دعویٰ تو کیا حسنِ جہاں سوز کا سب نے
دنیا کا مگر روپ بڑھایا تری چھب نے

تو نیند میں بھی میری طرف دیکھ رہا تھا
سونے نہ دیا مجھ کو سیہ چشمیِ شب نے

ہر زخم پہ دیکھی ہیں ترے پیار کی مُہریں
یہ گُل بھی کھلائے ہیں تری سرخیِ لب نے

خوشبوئے بدن آئی ہے پھر موجِ صبا سے
پھر مجھ کو پکارا ہے ترے شہرِ طرب نے

درکار ہے مجھ کو تو فقط اذنِ تبسّم،
پتھر سے اگر پھول اُگائے مرے رب نے

وہ حسن ہے انسان کی معراجِ تصوّر
جس حسن کو پُوجا ہے مرے شعر و ادب نے

دسمبر ۱۹۶۰ء

غزل

گل ترا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں سے
جل رہا ہوں بھری برسات کی بوچھاروں میں

مجھ سے کترا کے نکل جا، مگر اے جانِ حیا
دل کی لَو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں

حسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غنچے کھلتے ہیں تو بک جاتے ہیں بازاروں میں

ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے بعنوانِ جفا
چارہ گر پھول پرو لائے ہیں تلواروں میں

زخم چھپ سکتے ہیں، لیکن مجھے فن کی سوگند
غم کی دولت بھی ہے شامل مرے شہکاروں میں

منتظر ہیں کہ کوئی تیشۂ تخلیق اُٹھائے
کتنے اصنام ابھی دفن ہیں کہساروں میں

مجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

نومبر ۱۹۶۰ء

غزل

انقلاب اپنا کام کر کے رہا
بادلوں میں بھی چاند ابھر کے رہا

ہے تری جستجو گواہ، کہ تُو
عمر بھر سامنے نظر کے رہا

رات بھاری سہی، کٹے گی ضرور
دن کڑا تھا مگر گزر کے رہا

گُل کھلے آہنی حصاروں میں
یہ تعطّر مگر بکھر کے رہا

عرش کی خلوتوں سے گھبرا کر
آدمی فرش پر اُتر کے رہا

ہم چھپاتے پھرے دلوں میں چمن
وقت پھولوں پہ پاؤں دھر کے رہا

موتیوں سے کہ ریگِ ساحل سے
اپنا دامن ندیم بھر کے رہا

دسمبر ۱۹۶۰ء

خدیجہ زہرہ

جس کا جسم الجزائر کے شہر عزفہ میں اُس وقت فرانسیسی گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا، جب وہ فرانسیسی استبداد کے خلاف ایک مظاہرے میں حصّہ لے رہی تھی۔

جون ڈی آرک کے پیکر سے نکلتی لَو نے
کتنے خاکے رسن و دار کے دکھلائے ہیں
کتنی پوشیدہ صلیبوں کے لگائے ہیں سراغ

جب کہیں قافلۂ عشق رواں ہوتا ہے
جوان کا شعلۂ بیباک جواں ہوتا ہے
بھڑک اُٹھتے ہیں سلگتی ہوئی آنکھوں کے چراغ

فرانس کی بہادر بیٹی جس نے اپنے وطن پر انگریزی تسلط کے خلاف لڑی۔

خون کی تیرگی درد چمک اُٹھتی ہے
جون کی چاپ سے تاریخ کھنک اُٹھتی ہے
الجزائر میں دمک اُٹھتے ہیں روآن[1] کے داغ

کیا کبھی عظمتِ پیرس نے یہ سوچا بھی ہے؟
جون ڈی آرک، جمیلہ[2] بھی خدیجہ بھی ہے

جنوری ۱۹۶۰ء

[1] فرانس کا وہ مقام جہاں جون ڈی آرک کو نذرِ آتش کیا گیا تھا۔
[2] الجزائر کی مشہور مجاہد خاتون جو عالمی احتجاج کے باعث موت کی سزا سے تو بچ گئی۔ مگر تا دمِ تحریر محبوس ہے۔

غزل

بیکار ہے گرہ ترے بندِ نقاب کی
بادل سے چھن رہی ہے دمک آفتاب کی

اب تک زبان پر ہے ترے قرب کی مٹھاس
صدیوں کی طرح کٹتی ہیں گھڑیاں شباب کی

مبہم سی ایک آس پہ انسان زندہ ہے
جلتی ہے لَو، چراغِ حقیقت میں خواب کی

مجھ کو تو حسن و خیر کے پھولوں کی ہے تلاش
لڑھکا رہا ہے شیخ جٹانیں ثواب کی

فصلِ بہار میں بھی وہ تھی ہیبتِ خزاں
دستِ دعا بنی رہی پتی گلاب کی

دامانِ شب میں دن کے اُجالے کی بھیک ہے
تاروں میں بٹ گئی ہے کرن آفتاب کی

اک پل کی زندگی ابدیت سے کم نہیں
کس شان سے چلی ہے سواری حباب کی

ٹھہرا ہوں اُس خطا پہ سزاوار دار کا
سب نعمتوں سے میں نے حیات انتخاب کی

ہر ہر قدم پہ طُور بُلاتے رہے، مگر
فرصت کسے ندیمؔ سوال و جواب کی

جنوری ۱۹۶۱ء

تین سرزمینیں

سرزمینِ دل پہ ماضی کے رواں ہیں کارواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنی یادوں کے نشاں
اک طرف چہرے کتابوں کی طرح رازوں سے پُر
اک طرف تیور، تقاضے! — اک طرف آنکھیں، زباں
اک طرف جلتے ہُوئے ہونٹوں کی شمعیں شعلہ بار
اک طرف اُڑتا ہُوا گیسوئے مشکیں کا دھواں
اک طرف صرف ایک چٹکی میں گزرتے رات دن
اک طرف وہ پل کہ غش کھا جائے عمرِ جاوداں
اک طرف ہے وسعتِ گیتی، مگر محصور ہے
اک طرف ہے حلقۂ آغوش، لیکن بے کراں

سرزمینِ ذہن پر ہیں حال کے لشکر رواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنے زخموں کے نشاں
اک طرف امید کے پیڑوں پہ بور آیا ہُوا
اک طرف گھرتی، اُمڈتی، دندناتی آندھیاں

اک طرف ڈوبتے عقیدے، اک طرف مرتے یقیں
اک طرف صف بستہ ملبوسِ حقیقت میں گماں
اک طرف دشمن کو بھی دشمن پہ پیار آیا ہُوا
اک طرف نفرت کے نرغے میں خلوصِ دوستاں
اک طرف انسان خود اپنی نظر میں اجنبی
اک طرف ذرّوں کی مریخ و زحل سے شوخیاں

سرزمینِ حال پر ہے روحِ مستقبل رواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنے خوابوں کے نشاں
اک طرف ویران رستوں پر چمکتے ہم سفر
اک طرف ملبے کے ڈھیروں پر لچکتی کہکشاں
اک طرف افراد کے رشتوں میں آہنگِ نسیم
اک طرف قوموں کی باتوں میں گلوں کی نرمیاں
اک طرف تارے عروجِ آدمی کے مستقر
اک طرف گھر کی منڈیروں پر حدودِ لامکاں
اک طرف حسن و محبت، اک طرف تقدیسِ خیر
اک طرف صورتِ آدمیت، اک طرف ہفت آسمان

جنوری ۱۹۶۱ء

غزل

اپنی آنکھوں میں بسالی تری حیرت میں نے
کہ پلک تک بھی نہ جھپکی دمِ رخصت میں نے

فن کے پردے میں بھی کی تیری عبادت میں نے
اپنے اشعار کو دی تیری صباحت میں نے

سچ کہوں، اپنی محبت پہ ندامت سی ہُوئی
جب بھی دیکھی تری اُتری ہُوئی صورت میں نے

چمک اُٹھتا ہے سرِ شام تری یاد کا چاند
کبھی تاریک نہ دیکھی شبِ فرقت میں نے

آج بھی ہے مرے غم پر وہی ماضی کی بہار
توڑ دی گردشِ ایام کی ہیبت میں نے

اتنا عشق کی یہ ہے کہ ترے ظلم میں بھی
کی ہے محسوس تجھے پیار کی شدت میں نے

ایک شہ پارۂ فن کی طرح محفوظ رکھا
اپنے دل میں ترا اندازِ جراحت میں نے

میرا دشمن بھی مرے پیار کا حق دار بنا
تجھ سے کی ہے کہ زمانے سے محبت میں نے

اک دیا ہے جو نہ بجھتا ہے نہ پاس آتا ہے
عمر کاٹی کہ گزاری شبِ غربت میں نے

آج انا الانس کا مفہوم انا الحق ہے ندیمؔ
دار پر کھنچ کے بھی لی نہیں نیت میں نے

جنوری ۱۹۶۱ء

—

غزل

ہر ذہن میں منزل کا تصور تھا ہوائی
اپنے قدم اُٹھے تو زمانے کی بن آئی

اندازِ نظر کی ہے سب اعجاز نمائی
رنگت ہے سلگتے ہوئے صحرا کی حنائی

گہوارہ نگاہی بھی اک اندازِ وفا ہے
ہر حسن، ترے حسن کی ہے جلوہ نمائی

شب کو تو ذرا مشعلِ رخسار کی لَو دے
دن کو تو مرے سائے نے کی راہ نمائی

طے کر بھی سکوں گا کہ نہیں، کون بتائے
پھیلا ہوا تجھ تک ہے مرا دشتِ جدائی

ہر نقشِ قدم، گلشنِ فردا کی کلی ہے
صحراؤں کی رونق ہے مری آبلہ پائی

سچ ہے کہ جہاں تابعِ آئینِ خدا ہے
ویرانۂ دل پر ہے مگر میری خدائی

دامن مرا تر ہے، مگر اے داورِ محشر
اک دردِ محبت ہے مری نیک کمائی

اشکوں سے جو بچ نکلی ہے شعروں میں ڈھلی ہے
جو بات مری خلوتِ دل میں نہ سمائی

قطعہ

اس درد کا بھی کریں مداوا
اس دور کے چارہ گر کہاں ہیں
آنسو مرے دل میں گر رہے ہیں
نالے مرے خون میں رواں ہیں

غزل

مرا غرور، تجھے کھو کے، ہار مان گیا
میں چوٹ کھا کے مگر اپنی قدر جان گیا

کہیں افق نہ ملا میری دشت گردی کو
میں تیری دھن میں بھری کائنات چھان گیا

خدا کے بعد تو بے انتہا اندھیرا ہے
تری طلب میں کہاں تک نہ میرا دھیان گیا

جبیں پہ بل بھی نہ آیا گنوا کے دونوں جہاں
جو تُو چھنا، تو میں اپنی شکست مان گیا

بدلتے رنگ تھے تیری امنگ کے غماز
تُو مجھ سے بچھڑا، تو میں تیرا راز جان گیا

خود اپنے آپ سے میں شکوہ سنج آج بھی ہوں
ندیم، یوں تو مجھے اک جہان مان گیا

فروری ۱۹۶۱ء

ڈھلان

ریت پر ثبت ہیں یہ کس کے قدم؟
حسن کی نرم خرامی کی قسم
سرِ ساحل مری تخییلِ جواں گزری ہے
یا کوئی انجمنِ گل بدناں گزری ہے

موج نے نقشِ قدم چاٹ لیے
میری تخییل کے پر کاٹ لیے
لوگ دریاؤں کے انجام سے ڈر جاتے ہیں
اب تو دستے بھی سمندر میں اُتر جاتے ہیں

مارچ ۱۹۶۱ء

قفس کی تیرگی کچھ کم نہ تھی ہول آفرینی کو
کرن کے روپ میں تلوار رکھ دی کس نے گردن پر

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے، خدا جانے
محبت کا کوئی دھبا نہیں ہے جن کے دامن پر

عناصر سے نمٹ کر، کیا بتاؤں، کس سے نمٹے گا
ندیمؔ اب آدمی کے ہاتھ ہیں خود اپنی گردن پر

مارچ ۱۹۹۰ء

غزل

(نذرِ غالبؔ)

ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر
گھٹا کعبے سے اُٹھتی ہے، برستی ہے برہمن پر

خمارِ جانہ ویرانی میں یوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے بجلیوں نے رنگ چھڑکے ہیں نشیمن پر

چلو، دشتِ طلب میں ایک انساں تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جان کہ دوں دستِ رہزن پر

جفائے دوست کی مجھ سے شکایت ہو تو کیونکر ہو
وہ دیوانہ ہوں جس کو پیار آ جاتا ہے دشمن پر

شمیمِ گل تو رنگِ گل کے بس میں بھی نہیں رہتی
خزاں کیوں ہاتھ پھیلاتی رہی دیوارِ گلشن پر

دیوانہ

ایک دیوانۂ کامل، سرگذارِ حیات
ایک انبوہ میں چپ چاپ چلا جاتا ہے
ایک گل ہے کہ بگولے میں اُڑا جاتا ہے

زندگی شور مچاتی ہے کہ۔ اے دیوانے
زندہ لمحوں کو تو بچے بھی نہیں کھو سکتے
اتنے بے حس تو فرشتے بھی نہیں ہو سکتے

بڑھتا جاتا ہے وہ دیوانہ رآسودہ خرام
اور کہتا ہے کہ۔ "اے ہم نفسانِ معصوم
بھ کو معلوم ہیں جو راز، تمھیں کیا معلوم

رُک تو جاؤں چمستانِ جہاں میں۔ لیکن
میری آنکھوں سے تم آنکھیں تو ملا لو پہلے
مُٹھیاں کھول کے پتھر تو گرا لو پہلے"

مارچ ۱۹۶۱ء

غزل

فضا میں پیتی ہُوئی آنسو، ہوا — بھرتی ہُوئی آہیں
نہ جانے کس جہاں کو لے چلیں سُونی گزرگاہیں

وہی تشنہ لبی ہے اور وہی دشتِ غمِ دوراں
بزعمِ خویش یاروں نے تراشی تھیں نئی راہیں

خبر کیا تھی کہ یوں حساس ہوگا شب کا سناٹا
کراہیں بن کے گونج اُٹھیں گی جب دُکھی ہُوئی آہیں

اُسے چھونا بھی ممکن، سوچنا بھی تجھ کو ناممکن
تری دنیا میں یارب تجھ کو پوجیں یا اُسے چاہیں

زمیں کچھ اور ابھری، آسماں کچھ اور سولایا
ذرا انگڑائی لینے کو جب اٹھیں حسن کی باہیں

تمہارے بعد اک حسنِ ازل ہے، وہ بھی آوارہ
تمہارے چاہنے والے خدا سے اور کیا چاہیں

خواہشیں دل کی اُمڈیں گی ندیم اک سیلِ خوں بن کر
یہی پگڈنڈیاں مل جُل کے بن جائیں گی شاہراہیں

مئی ۱۹۶۱ء

بہار

اتنی خوشبو ہے کہ دم گھٹتا ہے
اب کے یوں ٹوٹ کے آئی ہے بہار
آگ جلتی ہے کہ کھلتے ہیں چمن
رنگ شعلہ ہے تو نکہت ہے شرار
روشوں پہ ہے قیامت کا نکھار
جیسے تپتا ہو جوانی کا بدن
آبلہ بن کے ٹپکتی ہے کلی
کونپلیں پھوٹ کے لَو دیتی ہیں
اب کے گلشن میں صبا یوں بھی چلی

جون ۱۹۶۱ء

غزل

یہ راز ہے جو از مرے انتظار کا
پژمردہ پھول، نقشِ قدم ہے بہار کا

آلامِ روزگار سے دل بجھ گئے، مگر
جلتا رہا چراغ تری رہگزار کا

مُند مُند گئی ہے گھور کے مجھ کو بھنور کی آنکھ
ممنون ہُوں کسی کے غمِ بے کنار کا

کیا پُوچھتے ہو میرے گناہوں کی سرگزشت
مجرم ہُوں صرف پیرہن تار تار کا

ہے آفتابِ مغربیاں مائلِ غروب
مشرق کی سمت ڈھلنے لگا سایۂ دار کا

کاٹیں گے کیسے شب کو جوانانِ عصرِ نو
اُن کو تو دھوپ پر بھی گماں ہے غبار کا

کلیاں تو زلفِ یار میں گوندھوں، مگر ندیم
ماتم تو کرُوں اُجڑی ہُوئی شاخسار کا

جون ۱۹۶۱ء

یہ ستارے

دن تو آلام کا میلہ ہے، سو کٹ جاتا ہے
چھپ کے رو لیتا ہوں، محفل میں چہک لیتا ہوں
(کتنی صدیوں سے یہی ہے مری دنیا کا چلن)
شب کو لیکن یہ ستارے نہیں سونے دیتے
سوچتا ہوں۔ مرے دل میں تری یادوں کی طرح
سینۂ شب پہ ستارے ہیں کہ زخموں کے چمن،
کون جانے کہ پسِ پردۂ ظلمات ہے کیا
اور پسِ پردۂ ظلمات ستارے ہی تو ہیں
یہ ستارے غمِ پنہاں کے اشارے ہی تو ہیں

جون ۱۹۷۱ء

غزل

آ گیا راس شکستوں کا شمار آخر کار
چھپ گئے یاد کے پھولوں میں اُمیدوں کے مزار

سورج اُبھرا ہے، کہ ڈوبا ہے، کہ گہنایا ہے
یا فقط اپنے لہو سے ہوئی دھرتی گلنار

اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے
جس طرف جائیے، زخموں کے لگے ہیں بازار

بوندیں بجتی ہیں کہ کنکر درِ تنہائی پر
ابر گھِر آیا ہے یا ٹوٹ پڑے ہیں کہسار

سر بچا لائے سو ہے، لیکن یہ زباں تو دیکھو
کتنا ویران ہے تا حدِّ نظر منظر دار

آدمی لاکھ بڑھے، فاصلے گھٹتے ہی نہیں
ہٹتا جاتا ہے، مگر چھپ نہیں پاتا ہے غبار

جوئے شیر آج بھی شیریں کے قدم دھوتی ہے
آج بھی تیشۂ فرہاد سے اڑتے ہیں شرار

وسعتِ دہر اک اجڑا ہوا معبد ہوتی
روزِ اوّل اگر ابلیس نہ کرتا انکار

نام اس طرح جو مٹتا ہے تو مٹ جائے ندیم
کسی قیمت پہ نہ کم ہو مرے فن کا معیار

جولائی ۱۹۶۱ء

مراجعت

(خلا میں انسان کی پرواز)

میری لب بستگی پہ نہ جاؤ
میرے دل میں قیامت بپا ہے
جانے کیا کیا ہیں میرے ارادے
ذہن چھلکا چلا جا رہا ہے
کیا بتاؤں، کہ لمحہ گزر کر
میرے کانوں میں کیا کہہ گیا ہے
یوں دما دم قدم اٹھ رہے ہیں
وقت حیراں کھڑا سوچتا ہے
طیش میں لاکھ آئیں عناصر
ابنِ آدم کہاں مانتا ہے

جتنے چبھتے ہیں تلووں میں کانٹے
حوصلہ اور بھی بڑھ رہا ہے

ایک چپ چاپ صحرا ابد کا
مجھ سے پوچھو، افق پار کیا ہے

کیوں لرزنے لگے ہو ستادہ
یہ تو پرواز کی ابتدا ہے

آسماں میری منزل نہیں ہے
آسماں تو خلا ہی خلا ہے

اپنی گم گشتہ جنت کو پالوں
صرف اتنا مرا مدعا ہے

ہوشیار اے فرشتو، کہ پھر سے
ایک سجدے کا وقت آرہا ہے

۴ اگست ۱۹۹۱ء

قطعہ

یہ حادثہ بھی رہے گا شامل
آدم کے عروج ہی کی مد میں
انسان اُبھر کر آگیا ہے
اِک شعلۂ بے اماں کی زد میں

جدید انسان

آج اک انسان سے مل کر مجھے محسوس ہُوا
جیسے محصور ہوں میں سیکڑوں انسانوں میں
اس کے چہرے پہ چمکتی تھیں ہزاروں آنکھیں
جس طرح دیو، اساطیر کے رومانوں میں
اس کے باوصف اس انسان نے یوں باتیں کیں
جیسے تاریکیٔ شب گونج اُٹھے کانوں میں
"فقط اتنا سا تغیر ہے کہ اس دَور کے لوگ
جھانکتے پھرتے ہیں غیروں کے گریبانوں میں
جن کو یہ بھی نہیں معلوم، کہ کل کیا ہوگا
اب بھی انسان کی گنتی ہے اُن انجانوں میں

لاکھ راہوں میں گزرنے کی کوئی راہ نہیں
منزلیں کھو گئیں تاریخ کے ویرانوں میں
جاگتے جاگتے کس طرح کٹے عمر کی رات
آنکھ مے خانوں میں لگتی ہے نہ غم خانوں میں
جن کو صدیوں کی عبادت سے بھی نفرت ہی ملی
میں بھی شامل ہوں انہی سوختہ سامانوں میں"

ستمبر ۱۹۶۱ء

غزل

(نذرِ سودا)

محور ہے یہی خواجگیِ کون و مکاں کا
نازک سا جو اک ربط ہے دل سے گریباں کا

میں خوش ہوں اگر دادِ وفا پائی کسی نے
اتنا تو بتا دو کہ یہ قصہ ہے کہاں کا

مہمل ہے بہاروں کے لیے اسلحہ بندی
کیا کام ہے کلیوں کے چٹکنے میں سناں کا

اے کاوشِ حسن میں خود حسن کے منکر
مجھ کو تو ہے دل پر بھی گماں شہرِ بتاں کا

صحرا بھی جھجکتے ہوں جہاں لالہ رخوں سے
ہے کفر وہاں صرف تصور بھی خزاں کا

چھوتی ہے تجھے لہر تو گھل جاتا ہے سونا
کل تک تو کوئی رنگ نہ تھا آبِ رواں کا

لفظوں میں ترا رنگ ہے شعروں میں ترا سحر
کہنے کو تو شہرہ ہے مرے حسنِ بیاں کا

اکتوبر ۱۹۶۱ء

رُوح لبوں تک آ کر سوچے

رُوح لبوں تک آ کر سوچے — کیسے چھوڑوں قریۂ جاں
یوسف، قصرِ شہی میں بھی، کب بھولا کنعاں کی گلیاں

موت قریب آئی تو دنیا کتنی مقدس لگتی ہے
کاہشِ دل بھی خواہشِ دل ہے، آفتِ جاں بھی راحتِ جاں

میری وحشت کو تو بہت تھی گوشۂ چشمِ یار کی سیر
یوں تو عدم میں وسعت ہوگی عرش بہ عرش، کراں بہ کراں

غنچے اب تک رنگ بھرے ہیں، اب تک ہونٹ امنگ بھرے
ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہیں پتھرائی آنکھیں نگراں

صرف اک نگہِ گرم سے ٹوٹیں، شعلوں میں پروان چڑھیں
ہائے یہ نازک نازک رشتے، ہائے یہ بزمِ شیشہ گراں

دشتِ دمن میں، کوہ و کمر میں، بکھرے ہوئے ہیں پھول ہی پھول
رُوئے نگارِ گیتی پر ہیں ثبت، مرے بوسوں کے نشاں

آنکھ کی اک جھپکی میں بیتا کتنے برس کا قربِ جمال
عشق کے اک پل میں گزرے ہیں کتنے قرن، کتنی صدیاں

ساری دُنیا میرا کعبہ، سب انساں میرے محبوب
دشمن بھی دو ایک تھے، لیکن دشمن بھی تو تھے انساں

دردِ حیات کہیں اب جا کر بننے لگا تھا حسنِ حیات
کس کو خبر تھی، محو رہے گی قطعِ سفر میں عمرِ رواں

جنت کی یخ بستگیوں کو گرمائے گا اس کا خیال
صبحِ ابد تک جمی رہے یہ انجمنِ آتشِ نفساں!

اکتوبر ۱۹۶۱ء

قطعہ

ماحول کے خول سے نکل کر
یہ نکتہ سمجھتے، کاش، ہم لوگ
ہر فرد کے اُن گنت خُدا ہیں
اب تک ہیں صنم تراش ہم لوگ

فنونِ لطیفہ

کلی چٹکتی ہے، جیسے کماں کڑکتی ہے
لہو میں ڈوب کے کھلتے ہوئے چمن کی قسم
گلوں کے روپ میں بکھرے ہوئے ہیں تن پارے
فصیلِ رنگ سے لاوے کی موجِ آتش بار
ہری ہری روشیں ہیں کہ زہر کے دھارے
گھرے ہیں کیسی قیامت کی فصلِ گل میں ہم
کچھ اس طرح سے ہیں گم سم، ہرے بھرے اشجار
کھڑے ہوں اجڑے ہوئے مندروں میں جیسے صنم
سکوت، خلوتِ کنجِ چمن میں گریاں ہے
ٹھہر گئی ہے زمیں، وقت پا بجولاں ہے
لرز رہے ہیں مگر زندگی کے لب کم کم

کوئی نہیں کہ جو فن کی گرفت میں لائے
اس ایک پل کو جو ہے خیمہ زن قرن بہ قرن
کوئی نہیں کہ جو چھو لے کٹار کی سی کرن
کوئی نہیں کہ جو اپنے لہو میں کرلے ضم
اس ایک پل کو، جو اک پل بھی ہے، صدی بھی ہے
جو اہلِ رقص ہیں شل ہو چکے ہیں ان کے قدم
جو اہلِ نے ہیں، وہ ہیں لے سے برسرِ پیکار
مصوروں نے کئی رنگ گھول کر دیکھے
نہ کر سکے مگر اک چشمِ شاہ کار کو نم،
پگھل گیا ہے چٹانوں میں دب کے سنگ تراش
اتر گیا ہے قلم کار کے جگر میں قلم

—

کون سُنے

فراز دار سے تا یستی حفاظت ذات
کوئی نہیں کہ جو احساس کی صدا سُن لے
اسی لیے تو ہر انساں کے لب پہ ہے یہ دعا
خدا کرے مری بپتا مرا خدا سُن لے

مطالبہ ہے یہ ہم عصر حق پرستوں کا
فضا میں چیخ سُنائی بھی دے دکھائی بھی دے
یقیں سے کون کہے نغمے ہیں کہ فریادیں
افق افق اگر اک شور سا سنائی بھی دے

بجھی بجھی مری آنکھیں، لٹا لٹا مرا رُوپ
کٹے کٹے مرے بازو، پھٹے پھٹے مرے لب
اب اس پہ بھی اگر اظہارِ درد لازم ہے
تو کس سے جا کے کہوں اپنی خامشی کا سبب

چٹانیں پیاس سے لٹکی ہوئی زبانیں ہیں
کوئی نہیں جو سُنے ان کا نوحۂ سنگیں
وہ لوگ سنگ میں آہنگ کیوں تلاش کریں
جنھیں گلہ ہی رہا۔ پھول بولتے ہی نہیں

نومبر ۱۹۶۱ء

غزل

عرش پر جا کے بھی جو خاک نشیں ہوتا ہے
خاک ہو جائے تو آزردہ نہیں ہوتا ہے

وہ بہشتوں کے محل ہوں، کہ فرشتوں کی اڑان
سایہ ہر چیز کا بر روئے زمیں ہوتا ہے

وہ عقیدت کا نشہ ہو کہ محبت کا خمار
وہم بڑھ جائے تو بنیادِ یقیں ہوتا ہے

صرف دیکھو تو تجلّی بھی ہے ظلمت کا نقاب
اور پرکھو تو اندھیرا بھی حسیں ہوتا ہے

حشر بھی آئے تو سر جھک نہ سکے جس کے بعد
وہی سجدہ ہے جو معراجِ جبیں ہوتا ہے

دیکھنا چاہو تو نظروں کو ٹھکانا نہ ملے
حسن اس رنگ سے بھی پردہ نشیں ہوتا ہے

اب نہ وہ ہم نہ وہ ہنگامہ ہے، ندیم
پھر تماشا سا یہ کیا دل کے قریں ہوتا ہے

جنوری ۱۹۶۲

غزل

تو بگڑتا بھی ہے خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ
پھول کھلتے ہیں ترے شعلۂ آواز کے ساتھ

ایک بار اور بھی کیوں عرضِ تمنا نہ کروں
کہ تو انکار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ

نَے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی
رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

تو پکارے تو چمک اٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

جب تک لہو زاں ہے زمانے میں کبوتر کا لہو
ظلم ہے، ربط رکھوں گر کسی شہباز کے ساتھ

پست اتنی تو نہ تھی میری شکست اے یارد
پر سمیٹے ہیں، مگر حسرتِ پرواز کے ساتھ

چرے بیٹھے ہیں قفس پر کہ ہے صیاد کو وہم
پر شکستوں کو بھی اک ربط ہے پرواز کے ساتھ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

جنوری ۱۹۶۲ء

سوداگریِ حُسنِ سخن

آنکھوں کے سمندر ہوں کہ ہونٹوں کے چمن ہوں
ہر چیز کا ہر شہر میں بازار لگا ہے
مرمر کے ہوں اجسام کہ سونے کے بدن ہوں
ہر جنس کا ہر موڑ پہ انبار لگا ہے
صندل کے ہوں تابوت کہ ریشم کے کفن ہوں

اس دور کا انسان بڑا صاحبِ فن ہے
اے صاحبِ فن شعر پہ اُچٹتی سی نظر کیوں
یہ فن بھی تو سوداگریِ حسنِ سخن ہے
شاعر کی برستی ہُوئی آنکھوں سے حذر کیوں
آنسو فقط آنسو ہی نہیں دُرِّ عدن ہے

جنوری ۱۹۶۲ء

غزل

شبِ فراق کو جب مژدۂ سحر آیا
تو اک زمانہ ترا منتظر نظر آیا

تمام عمر کی صحرا نوردیوں کے بعد
ترا مقام سرِ گردِ رہگزر آیا

یہ کون آبلہ پا اس طرف سے گزرا ہے
نقوشِ پا میں جو پھولوں کے رنگ بھر آیا

کسے مجال کہ نظارۂ جمال کرے
اس انجمن میں جو آیا، بچشمِ تر آیا

تری طلب کے گھنے جنگلوں میں آگ لگی
مرے خیال میں جب وہمِ رہگزر آیا

سمٹ گیا مری باہوں میں جب وہ پیکرِ رنگ
تو اس کا رنگ مجھے دور تک نظر آیا

اس آرزو میں کہ ضدِ کبریا کی پوری ہو
ندیمؔ خاک پہ افلاک سے اُتر آیا

جنوری ۱۹۶۲ء

قطعہ

میری خاموشیِ پیہم پہ نہ جا
تو مجھے اب بھی نہیں بھولا ہے
چاندنی رات کی آواز تو سُن
ابھی خورشید کہاں ڈوبا ہے

غزل

یوں تو پہنے ہُوئے پیراہنِ خار آتا ہُوں
یہ بھی دیکھو کہ بسودائے بہار آتا ہُوں

عرش سے جب نہیں اٹھتی مری فریاد کی گونج
میں تجھے دل کے خرابے میں پکار آتا ہوں

مجھے آتا ہی نہیں بس میں کسی کے آنا
آؤں بھی تو بکفِ آبلہ دار آتا ہوں

تُو وہاں، زیرِ اُفق، چند گھڑی سستا لے
میں ذرا دن سے نمٹ کر، شبِ تار آتا ہوں

تجھ سے چُھٹ کر بھی، تری سرخیِ عارض کی قسم
چپکے چپکے ترے دل میں کئی بار آتا ہوں

میرا ایثار اِس الزام سے کیسا کم ہوگا
جانبِ دار بوہم قدِ یار آتا ہوں

یہ الگ بات کہ پھولوں پہ ہو زخموں کا گماں
میں تو جب آتا ہوں، ہم رنگِ بہار آتا ہوں

دشتِ ہر فکر سے، میں عصرِ رواں کا اِنساں
ہو کے خود اپنی ذہانت کا شکار آتا ہوں

انہی دو باتوں میں کٹ جاتی ہے شبِ عمر ندیمؔ
اے غمِ دہر! نہ چھیڑ، اے غمِ یار! آتا ہوں

جنوری ۱۹۶۲ء

غزل

کیا کہوں، اب تجھ کو اپنا کر بھی کیوں افسردہ ہوں
میں ترے پندار کی اُفتاد سے آزردہ ہوں

میں جدید انسان، باوصفِ غرور و تمکنت
پتھروں کے دیوتاؤں کی نگاہِ مردہ ہوں

دوستوں کی نفرتیں بھی کیوں مجھے پیاری نہ ہوں
میں تو اپنے دشمنوں تک کا محبت خوردہ ہوں

منحصر ہے میرے مٹنے پر شگفتِ صد چمن
میں بظاہر شاخِ ہستی کا گلِ پژمردہ ہوں

میری سانسیں سنسناہٹ شہپرِ جبریل کی
کیا بتاؤں، کن بہشتوں کی متاعِ بُردہ ہوں

جنگل کی آگ

آگ جنگل میں لگی تھی، لیکن
بستیوں میں بھی دھواں جا پہنچا
ایک اُڑتی ہُوئی چنگاری کا
سایہ پھیلا تو کہاں جا پہنچا

تنگ گلیوں میں اُٹھتے ہُوئے لوگ
گو بچا لائے ہیں جانیں اپنی
اپنے سر پر ہیں جنازے اپنے
اپنے ہاتھوں میں زبانیں اپنی

آگ جب تک نہ بجھے جنگل کی
بستیوں تک کوئی جاتا ہی نہیں
حُسنِ اشجار کے متوالوں کو
حُسنِ انساں نظر آتا ہی نہیں

غزل

دیارِ عشق کا یہ حادثہ عجیب سا تھا
رُخِ رقیب پہ بھی پرتوِ حبیب سا تھا

فراق زخم سہی، کم نہ تھی جراحتِ وصل
معانقہ مرے محبوب کا طبیب سا تھا

ترے جمال کی سرحد سے کبریا کا مقام
بہت قریب تو کیا تھا، مگر قریب سا تھا

سنی ہے میں نے صدائے شکستِ نکہت و رنگ
خزاں کی راہ میں ہر پھول عندلیب سا تھا

برادرانِ وطن کے سلوک کی سوگند
ندیمؔ یوسفِ کنعاں کا ہم نصیب سا تھا

فروری ۱۹۶۲ء

غزل

پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہُوا دیکھوں
آنکھوں کو بجھا لوں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا، مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو، وہی بات نہ کہہ دوں

ہر سوچ پہ، خنجر سا گزر جاتا ہے دل سے
حیراں ہوں کہ سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

سناٹے اُڑا دیتے ہیں آواز کے پُرزے
یاروں کو اگر دشتِ مصیبت میں پکاروں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھُو لوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہُوئی وحیں
بازار میں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

جینے پہ جو مجبور ہو، جی کر وہ کرے کیا
صحرا میں کبھی خضر جو مل جائے تو پوچھوں

ملتی نہیں جب موت بھی مانگے سے تو یارب
ہو اذن تو میں اپنی صلیب آپ اُٹھاؤں

یاد آنے لگا ہے مجھے انجامِ بہاراں
اے ابرِ کرم، تیری اجازت ہو تو رو لوں

سُوکھا ہُوا پتّہ ہوں مگر اے شبِ تاریک
میں ایک ستارہ ہوں اگر شاخ سے ٹوٹوں

مارچ ۱۹۶۲ء

قطعہ

برحق سہی میری موت، لیکن
جینے کے شعور کو کروں کیا
اے میرا دیا بجھانے والے
میں جلوۂ طور کو کروں کیا

غزل

وہی بہشت کی تنہائیوں سے بیزاری
ہوئی نہ مجھ سے فرشتوں کی نازبرداری

مرے خیال میں جیسے جمالِ یار کی لو
نہاں ہے شب کے دھوئیں میں سحر کی چنگاری

چھپا ہے یوسفِ عصرِ رواں مرے دل میں
کہ بڑھ رہی ہے بہت حسن کی خریداری

کلی کلی متحیر، چمن چمن پامال
ذرا بہار کی دیکھو تو گرمِ رفتاری

میں اُس مقام پہ ہوں ضبطِ عشق کے ہاتھوں
جہاں سکوت، صدا کی ہے آئنہ داری

گجر سحر کا بجا لوں تو ہر سزا منظور
مرا گناہ سہی نصف شب کی بیداری

ہے ان کے پاس تبسم ہی ہر ستم کا جواب
وہ جن کے دل پہ رہی درد کی علمداری

نئی زباں میں مہذب اسی کو کہتے ہیں
بلند جس کا ہو معیارِ مردم آزاری

ندیمؔ، چاند پہ انسان کے پہنچنے تک
اُبھر نہ جائے عناصر کی چار دیواری

—

اپریل ۱۹۶۲ء

طوائف

صدیوں پہلے کا ذکر ہے، جب لوگ
خوف کو دیوتا سمجھتے تھے

سرخ کوندوں، سیہ گھٹاؤں کو
چیختی، پیٹتی ہواؤں کو
اپنے اپنے خدا سمجھتے تھے

قصرِ شاہی سے ایک شہزادی
بُت کدے کی طرف روانہ ہُوئی

پتلیوں میں جواں لہو کی چمک
اور اچھوتے لبوں میں رس کی دمک
رُت بدلنے کا اک بہانہ ہُوئی

دیوتاؤں کے پاؤں پر اس نے
خون چھڑکا بھری جوانی کا

جذبے معصوم، تجربے کم سن
روح تسلا کے رہ گئی، لیکن
جسم آغاز تھا کہانی کا

اک پجاری نے اس کا دشتِ بدن
چھُو کے دیکھا تو غنچے کھلنے لگے

کونپلوں میں نمو کا رس مچلا
جسم کا جذبۂ ہوس مچلا
ابر اُمڈے، پہاڑ ملنے لگے

کل کی اک سربلند شہزادی
آج سب کی نظر میں ہیچ ہے

یوں تو بن ٹھن کے آئی ہے سرِ بام
اور "بنت الہوا" ہے اس کا نام
کنچنی دیوتا کی بیٹی ہے

مئی ۱۹۶۲ء

غزل

(نذرِ میر)

کتنی تیتاگ ہے ساری دنیا کی نظروں میں سمائی ہوئی
جتنے ہم تجھ سے کترائے، اتنی تری رسوائی ہوئی

ترکِ تعلق سے تو ہم نے غیرتِ عشق کو تجیرکا تھا
تیرے تصور سے تو ورنہ برسوں بعد جدائی ہوئی

یادوں کے ظلمات میں اب بھی ٹوٹ رہے ہیں ستارے
بھوبھل بن کر سلگ رہی ہے آج بھی آگ بجھائی ہوئی

پلٹ گئی رُت جب تک رنگِ چمن سے ہم مانوس ہوئے
یوں صیاد کے کہنے کو تو موسمِ گل میں رہائی ہوئی

دھول اُڑائیں دشتِ وفا میں آندھی بن کر نکہت و رنگ
بسترِ شب سے چنیں کنیزیں جب کلیاں مرجھائی ہوئی

حسن و توازن کے رسیا ہیں، کیوں اضداد سے صلح کریں
اسی لیے تو صحنِ حرم میں برہمنوں سے لڑائی ہوئی

فانی ہے انسان تو کیسے لاکھوں برس سے زندہ ہے
سب دھندا ہے عجزِ نظر کا، ساری بات بنائی ہوئی

اب بھی ندیمؔ ضمیر پہ تیرے مصلحتوں کے پہرے ہیں
ورنہ کیسے رک جاتی ہے بات زباں پر آئی ہوئی

مئی ۱۹۶۲ء

ریستوران

ریستوران میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے
قبروں کے کتبوں پر جیسے مسلے مسلے سہرے

اک صاحب جو سوچ رہے ہیں پچھلے ایک پہر سے
یوں لگتے ہیں جیسے بچہ روٹھ آیا ہو گھر سے
کافی کی پیالی کو لبوں تک لائیں تو کیسے لائیں
بیرے تک سے آنکھ ملا کر بات نہ جو کر پائیں

کتنی سنجیدہ بیٹھی ہے یہ احباب کی ٹولی
کتنے اوجِ بلاغت پر ہے خاموشی کی بولی
ساری قوت چوس چکی دن بھر کی شہر نوردی
ماتھوں میں سے جھانک رہی ہے مرتی دھوپ کی زردی

لمبی لمبی پلکیں جھپکے اک شرمیلی بی بی
بالوں کی ترتیب سے جھلکے ذہن کی بے ترتیبی
شوہر کو دیکھے تو لجائے۔ لاج کو اوٹ بنائے
ہر آنے والے پر اک بھرپور نظر دوڑائے

اک لڑکی اور تین جوان آئے ہیں کس کے کسائے
سانولے روپ کو گورے ملکوں کا بہروپ بنائے
باتوں میں نخوت باغوں کی، وحشت صحراؤں کی
آنکھوں کے چولھوں میں بھری ہے اکھ تمناؤں کی

اپنی اپنی الجھن سب کی، اپنی اپنی رائے
سب نے آنسو روک رکھے ہیں کون کسے بہلائے
ہر شے پر شک ہو تو جینا ایک سزا بن جائے
محور ہی موجود نہ ہو تو گردش کس کام آئے

قہقہے، جیسے خالی برتن لڑھک لڑھک کر ٹوٹیں
بحثیں، جیسے ہونٹوں میں سے خون کے چھینٹے چھوٹیں
حسن کا ذکر کریں یوں، جیسے آندھی پھول کھلائے
فن کی بات کریں یوں، جیسے بنیا شعر سُنائے

سکڑی سمٹی روحیں، لیکن جسم ہیں دہرے تہرے
ریستوران میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے

مئی ۱۹۶۲ء

غزل

پھول ہیں گلشن میں کچھ خوابیدہ، کچھ بیدار سے
بستی جاتی ہیں مری یادیں شمیمِ یار سے

لوگ کہتے ہیں انھیں تاریخِ انسانی کے موڑ
راستے جب جھوم اُٹھتے ہیں تری رفتار سے

کون گل چینوں کو سمجھائے کہ معصومانِ گل
کٹ تو سکتے ہیں، چمک سکتے نہیں تلوار سے

اتنے بے مایہ نہیں ہوتے خزاں کے پھول بھی
رُت کا اندازہ نہ ہوگا نکہتِ گلزار سے

دل کا اک اک زخم، اک اک شمع بن کر جل اُٹھا
درد یوں چمکا کسی کے شعلۂ گفتار سے

ایک پل گزرا کہ اک آئی قیامت ٹل گئی!
وقت نے سیکھا ہے اٹھلانا خرامِ یار سے

اس قدر پھیلا ہے زنداں کا حصارِ بے اماں
شہر بھی لبریز ہیں زنجیر کی جھنکار سے

زندگی مشکل ہے لیکن موت بھی آساں نہیں
دشت میں سر پھوڑنے نکلے ہو کس دیوار سے

لالہ صحرا کبھی، سنگِ رہِ دریا کبھی
زندگی! تو نے مجھے برتا ہے کتنے پیار سے

حسنِ شیریں اب بھی ہے شاید اسیرِ قصرِ سنگ
ورنہ کیوں آتی ہے تیشے کی صدا کہسار سے

شعر کہنے کا مزا جب ہے کہ صدیوں تک ندیمؔ
آئینے بنتے چلے جائیں مرے اشعار سے

مئی ۱۹۶۲ء

جواز

علم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے ہر چیز کی پیاس
پیاس ہے شکل میں تاریکیِ دوراں کا چراغ
ہے اسی پیاس پہ شادابیِ عالم کی اساس
جتنا ویراں ہو شکم، اتنا مہکتا ہے دماغ
کس قدر پھول کھلے ہیں سرِ راہِ افلاس
بدلا بدلا نظر آتا ہے نظامِ کونین
جیسے انسان ہوں مسرور، فرشتے ہوں اداس
علم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے ہر چیز کی پیاس

اب یہ عالم ہے کہ تنہائیِ شب میں اکثر
کبریائی کی بھی سنتا ہوں صدائے انفاس
میری وحشت سے ڈرے دہر کے دو علم فروش
ہر حقیقت کو جو کر لیتے ہیں پابندِ لباس
علم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے ہر چیز کی پیاس

اب تو ہر درد کا درماں ہے نئے درد کی ٹیس
اب تو ہر زخم کسی زخم کا ہے درد شناس
اب تو کہلاتا ہوں میں مملکتِ دل کا رئیس
جام خالی ہے مگر دولتِ احساس ہے پاس
رہ گئی تشنگیِ لب، تو حقیقت یہ ہے
علم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے ہر چیز کی پیاس

مئی ۱۹۶۲ء

ہجر و وصال

شب ترے جسم کو چھُو کر مجھے محسوس ہُوا
دل کے جنگل میں نہ پہنچے گی ترے لمس کی آگ
نہ وہ لرزش تھی بدن میں، نہ لہو میں دم تھا
تیری نبضیں تھیں کہ اک سلسلۂ ماتم تھا
وقت نے لُوٹ لیا تھا ترے پیکر کا سہاگ

اب کہ تو شب کی طرح میری رسائی میں نہیں
میری رگ رگ میں ترے لمس کے شعلے ہیں رواں
میرے ہاتھوں کی یہ پوریں ہیں کہ شمعوں کی لویں
میرے ہونٹوں میں تپاں ہیں تری سانسوں کی رویں
میری آنکھوں میں بسا ہے تری زلفوں کا دھواں

جانے یہ کون سی منزل ہے تری چاہت کی
تیرے ملتے ہی بدل جاتا ہے معیارِ جمال
تیرے چھٹتے ہی مرا عشق جواں ہوتا ہے
رات پر بھی تری آنکھوں کا گماں ہوتا ہے
یہ فراقِ تن و جاں ہے کہ غبارِ مہ و سال

جولائی ۱۹۶۲ء

مشرق و مغرب

گرم ملکوں کا رہنے والا ہوں
برف زاروں سے کتنے ساگر دور
ایک چھالے کی طرح صحرا میں
میرا خاکستری گھروندا ہے
جس کے چٹخے ہوئے کواڑوں میں
جس کی دہلیز کے نشیب کے پاس
فنِ تعمیر کا پرانا پن
ایک ویرانہ بن کے بیٹھا ہے

چاندنی رات سرد ملکوں کی
نیلی برفوں میں منعکس ہو کر
اپنی کرنوں کی جھالروں میں چھپی
ایک رومان بن کے آتی ہے
چاندنی رات گرم ملکوں کی
محنتوں کی تھکن کے سناٹے
اپنی ننگی کمر پہ لادے ہوئے
ایک طوفان بن کے آتی ہے

سرد ملکوں کی دوپہر کا لباس
ایک ایسی مہین چادر ہے
جس کی پرتوں میں جسم کا سونا
قمقمے بن کے مسکراتا ہے
— اور اپنا لباس عریانی
جس پہ سورج، شعاعوں کے کوڑے
اِس قدر طیش سے لگاتا ہے
راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتا ہے

گرم ملکوں میں حسن کی قدریں
کتنی اندھی، قدیم صدیوں سے
آگ بھڑکا کے اپنے پیکر کی
اپنے ہی گیسوؤں کا بن کے دھواں
زندگی کے اداس آنگن میں
اِک الاؤ لگائے بیٹھی ہیں
اور اس گردبادِ آتش میں
جل رہی ہیں گلاب کی کلیاں

گرم ملکوں کے عشق پیشہ جواں
دھوپ کی چلچلاتی نگری میں
ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں
اور پھر عاقبت کو روتے ہیں
ان کی محنت پہ وجد کرتے ہوئے
موتیوں سے لدے ہوئے خوشے
جتنے بھرپور ہوتے جاتے ہیں
اتنے ہی دُور ہوتے جاتے ہیں

سرد ملکوں میں حسن و عشق کی رَو
زندگی سے قدم ملائے ہُوئے
آسماں کی طرح، فضا کی طرح
روز و شب پر محیط رہتی ہے
گھر میں، معبد میں، یا سرِ راہے
ہر طرف، ہر مقام پر، ہر وقت
جب بھی حسن اور عشق ملتے ہیں
گرم بوسوں کے پھُول کھلتے ہیں

سرد ملکوں میں کتنی گرمی ہے
جسم کی، روح کی، خیالوں کی
گرم ملکوں پہ سرد و مردہ سکوت
ایک آسیب بن کے طاری ہے
سرد ملکوں میں زندگی کا شعور
ایک ذرّے کو بھی سنوارتا ہے
گرم ملکوں میں موت کا احساس
ٹھوکریں زندگی کو مارتا ہے

سرد ملکوں کے رہنے والے دوست
میں کھنڈر کے ستون کی مانند
سوچتا ہوں — کہ اس خرابے میں
میں اگر بس وہی ہوں جو کچھ ہوں
میں اگر ولولوں کا ملبہ ہوں
میں اگر حوصلوں کا مرقد ہوں
میرے جینے کا پھر جواز ہے کیا
آخر اس بے بسی کا راز ہے کیا

سوچتا ہوں — (میں سوچ لیتا ہوں)
چاند جو میرے گھر میں نکلا ہے
تیرے ایوان میں بھی جھانکے گا
جس زمیں پر میں ایستادہ ہوں
نیلے نیلے سمندروں کے تلے
دبتی، اُٹھتی، لچکتی جاتی ہے
اور بن کر ترے وطن کی زمیں
تیرے قدموں کو تھپتھپاتی ہے

سوچتا ہوں — کہ میری حالتِ زار
کیا فقط رنگ کی شرارت ہے
کیا فقط اس لیے حقیر ہوں میں
کہ یہاں دھوپ چلچلاتی ہے
کیا فقط اس لیے عظیم ہے تُو
کہ تری کھڑکیوں کے شیشوں سے
جب کرن آفتاب کی جھانکے
برف اس کی ہنسی اُڑاتی ہے؟

رنگ اور رُت نہیں مدارِ حیات
رنگ سورج کا ایک زاویہ ہے
رُت فقط ایک رُخ ہے دھرتی کا
میرے چہرے کا رنگ میری دھوپ
تیرے چہرے کا رنگ، برف تری
تو مری دھوپ کو ترستا ہے
میں تری برف کے لیے بے چین
دو مسافر ہیں — ایک رستہ ہے
(نامکمل)

فردیات

بجا، کہ جام بکف ہوں مگر شراب کہاں ہے؟
گجر تو، خیر، بجا لیکن آفتاب کہاں ہے؟

○

اس بے بسی میں آپ ہی اپنی نظیر ہیں
ہم نکہتِ چمن کے بھنور میں اسیر ہیں

○

میری بینائی کا دھوکا ہے کہ ایام کا پھیر
ابدیت کا افق ہے کہ گھروندے کی منڈیر

○

سحر بدست بھی ہے شب، اگر سیاہ بھی ہے
چٹان سنگ ہے لیکن صنم پناہ بھی ہے

○

عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

کون یہ سوختہ جاں اُٹھا ہے — شمعِ محفل سے دھواں اُٹھا ہے

○

آج کے دن کا بدل کیا ہوگا — کل ہی سوچیں گے کہ کل کیا ہوگا

○

اب تجھ سا کوئی کہیں نہیں ہے — اب تیرا فراق بھی حسیں ہے

○

چمکا ہے جو میرے دل میں شب بھر — اس درد کی چاندنی میں آنا

○

تاروں بھرا آسماں ۔ محبت — جذبات کا بحرِ بے کراں ۔ ہم

○

یہ ترے جسم کی مہکار تھی یا پھولوں کی — میں ترے پاس سے یا صحنِ چمن سے گزرا

○

تم دیئے ہو جو لرزتے ہو صبا کے ڈر سے
ہم ستارے ہیں جو طوفاں سے گزر جاتے ہیں

○

میری یادوں کے افق پر آپ کے وعدوں کے چاند
اس قدر چمکے نہیں ہیں جس قدر گہنائے ہیں

مجھے قسم ہے مری شانِ آدمیت کی — فریب دے نہ سکوں گا۔ فریب کھائے تو میں

○

حق دارِ فصلِ گل کے وہی رہ نورد ہیں — جو خاک چھان کر بھی نہ بھولے چمن کا نام

○

اگر چلے ہو مسافت خزاں کی طے کرنے — بھری بہار کا بھی اہتمام کر کے چلو

○

شبِ سیہ کے ستارو مرے قریب رہو — کہ میں افق پہ نگارِ سحر کو دیکھ آؤں

○

تہذیب کے طاق پر ہمیشہ — جلتے ہیں چراغ مفلسی کے

○

اہرمن بن کے بھی دیکھا ہے، کہ انساں کا ضمیر
نور ہی نور ہے، شعلے کا کہیں نام نہیں

○

تاریخ کو تقدیر سمجھنے والو — تاریخ تو تخلیق ہے انسانوں کی

○

شاہد ہے شکستہ پائی اپنی — پہنچے نہیں ناگہاں یہاں ہم

○

دیدنی ہے شبِ فراق کا حسن — موت آئی تو ہم بھی سو رہیں گے

ترے پہلو سے اُٹھ کر کھو گئے ہم خیالوں کی گھنی تنہائیوں میں

○

سورج اُبھرا کہ قیامت جاگی رات گزری کہ زمانے گزرے

○

ہر طرف پھوٹتی پَو کو دیکھو ڈوبتے چاند کا ماتم نہ کرو

○

بادلوں کے حاشیے روشن ہیں کوندے کی طرح
کچھ تو ہے جس نے بدل ڈالا ہے ظلمت کا مزاج

○

تمام رات امیدوں کے چاک سلتے رہے
تمام شب ترے قدموں کی چاپ آتی رہی

○

میں اپنی تیرہ نصیبی کا بھید کیا کھولوں
کہ مجھ کو ساحلِ شب تو ملا، سحر نہ ملی

○

ہاتھ میں آتے ہی گُل کچھ اس طرح کملائے ہیں
ہم نے جتنے دھوکے کھائے ہیں، وہ سب یاد آئے ہیں

صبح تیری ہے، تو اے خالقِ صبح رات ہے کس کی کرم فرمائی

○

گرتے ہوئے پتّے ہوں کہ مینہ کے جھالے
ہر چیز میں گنگنا رہی ہے تخلیق

○

یہ گزرتے ہوئے پل ہیں کہ تری آنکھیں ہیں
دن ہے آنسو کی طرح، رات ہے کاجل کی سی

○

آتشِ عشق جلاؤ کہ سفر ہے دشوار
راہ میں کتنے عقیدوں کا گھنا جنگل ہے

○

اک سفینہ ہے تری یاد اگر اک سمندر ہے مری تنہائی

○

اے ٹوٹتی رات کے ستارو تم کتنے اداس ہو رہے ہو

○

بجھ گئی ہیں مری آنکھیں، مگر اے شامِ فراق
یہ دئے اُن کے خیالوں میں تو جلتے ہوں گے

غرورِ عشق کو ضد ہے کہ تیرا عہدِ وفا — شکست کھا کے بھی تقدیس کھو نہیں سکتا

○

تخلیق کے ذوقِ جاوداں سے — اِنسان، خدا کا ترجماں ہے

○

بھُولے گا نہ اے بہار، تیرا — چھپ چھپ کے کلی کلی میں آنا

○

بادل اُمڈے ہیں۔ آگ برسے گی — باغ مہکے ہیں — زاغ بولیں گے

○

یہ ترا تصرّفِ حسن ہے کہ مرا غرور نیاز ہے
تری جستجو پہ بھی فخر ہے، تری ہمرہی پہ بھی ناز ہے

○

کیا جانے کیا اثر تھا شعورِ گناہ میں — تارے چمک اُٹھے تری چشمِ سیاہ میں

○

اُمڈی ہیں گھٹائیں اِتنی کہ — برسیں گے ستارے آسماں سے

○

ندیم، شعر فقط پرتوِ حیات نہیں
حدیثِ ذات بھی، رودادِ کائنات بھی ہے

تکملہ

معاشراں گرہ از زلفِ یار باز کنید
شبے خوش است بدایں قصہ اش دراز کنید

احمد ندیم قاسمی کے کلام کا یہ تیسرا مجموعہ ہے، جس کے تعارف کی تقریب میرے حصے میں آئی اور میری حالت حقیقتہً یہ ہے:

در عرضِ غمش پیکرِ اندیشہ لالم
پا تا سرم اندازِ بیان است و بیاں نیست

ابتدا ہی میں مجھے بے تکلف عرض کر دینا چاہیے کہ تعارف کی یہ خدمت میں نے بطیبِ خاطر اپنے ذمے لی، اس کے لیے مجھے مجبور نہ کیا گیا۔ بلاشبہ اوّلاً میرے مشاغل ایسے نہ تھے کہ ایک بلند پایہ مجموعۂ کلام کے تعارف کا حق ادا کرنے کے لیے خاصا وقت نکال سکتا، جس میں دماغ کسی دوسری مصروفیت سے کاملاً محفوظ رہتا۔ ثانیاً مجھ میں کوئی ایسی خصوصیت موجود نہ تھی۔ جو اس اہم ادبی فرض کی بجا آوری کے لیے ضروری تسلیم کی جاتی ہے۔ مثلاً مجھے دورِ ماضی یا عہدِ حاضر کے اصول و دقائقِ نقد و نظر سے صرف سرسری شناسائی حاصل ہے۔ میں نے ان اساتذۂ شعر کے کلام کا بھی گہرا مطالعہ نہیں کیا، جن کے اسمائے گرامی دورِ حاضر میں آبروئے سخن مانے جاتے ہیں

ہیں اور جنھوں نے اپنے خاص اسلوب پیدا کر لیے، اسی لیے اربابِ نقد و نظر تحریروں اور گفتگوؤں میں ان کے نام بے تکلف استعمال کرتے رہتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ محاسن و معارفِ شعری کے فہم میں مجھے خاص بصیرت حاصل ہے۔ سب سے آخر میں یہ کہ میں، رومانی اسلوبِ بیان سے بالکل ناآشنا ہوں، حالانکہ آج کل انتقاد کے لیے یہ اسلوبِ بیان ضروری سمجھا جاتا ہے اور اسی کی بدولت مختلف ادبی مباحث میں ایک خاص وضع کی دلآویزی یا دانش وسعتِ نظر نیز فکر کی گہرائی اور تحریر و تسوید کی گیرائی کا دبدبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے فارسی اور اردو کے بعض مشہور اساتذہ کا کلام مدت العمر انتہائی ذوق و شوق سے پڑھا ہے۔ اس شغف و انہماک سے شعر کی خوبیوں اور خوش اسلوبیوں کے متعلق جو کچھ میرے ذہن میں پیوست ہو چکا ہے، اسی کی بنا پر تعارف لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ گویا "بضاعتِ مزجاۃ" کے ساتھ یوسف کی خریداری کے شوق میں نکل پڑا۔ اس دائرے میں قدم رکھنے کی جسارت کی، جہاں علم و تحقیق میں رتبۂ بلند حاصل کیے بغیر کسی کو بار نہیں مل سکتا۔ اس جسارت کے لیے میرے پاس کوئی معقول و دلپذیر عذر بھی موجود نہیں، البتہ میری آرزو یہ تھی کہ کوئی مناسب موقع میسر آجائے تو ندیم کی شاعری کے متعلق اپنے دل تاثرات پیش کروں۔ امید ہے اربابِ فکر و نظر از راہِ لطف و نوازش میری کوتاہیوں اور درماندگیوں سے اغماض فرمائیں گے۔ میں اپنی انتہائی فرومایگی کے باعث اپنے آپ کو ان کی نکتہ چینی کے شایاں بھی نہیں سمجھتا۔ بقول نظیری:

آں شکارم من کہ لائق ہم بہ کشتن نیستم
شرم می آید مرا زاں کس کہ صیادِ من است

میں مدت تک ندیم کے مجموعہ ہائے کلام بھی بالاستیعاب نہ پڑھ سکا۔ ان کی متفرق نظمیں اور غزلیں ہی دیکھ کر یہ احساس پختہ تر ہوتا گیا کہ جو دل سوز صدائیں ان کے دردمند قلب سے اٹھ رہی ہیں وہ عام نہیں، خاص ہیں۔ ان میں ایک نادر کشش، ایک یگانہ جاذبیت اور ایک انوکھی دل آویزی ہے۔ چنانچہ جب کبھی ان سے ملاقات ہوئی، یہی کہتا کہ بھائی! آپ کو قدرت نے صرف شعر کے لیے پیدا کیا ہے۔ کتنا ظلم ہے کہ آپ پورا وقت شعر ہی کے لیے وقف کر دینے کی بجائے دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کاش آپ صرف شعر سے وابستہ رہتے۔

مرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے:

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

شعر کے متعلق میرا احساس یہی ہے کہ یہ فن یا مشغلہ دوسرے فنون و مشاغل سے اشتراک کا روادار نہیں۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ شاعر کی توجہ تمام تر یا تو شعر پر مرتکز رہے یا وہ اس سے قطعِ علائق کر کے جو مشغلہ چاہے، اختیار کر لے۔ شعر احساس و فکر کی ایک لطافت و نظافت اور ہر قسم کی آمیزش سے پاکیزگی کا خواہاں ہے۔ جب تک دل و دماغ ایک مجلّی آئینے کی شکل اختیار نہ کر لیں، نہ عالمِ بالا کا فیضان اس آئینے میں ٹھیک ٹھیک منعکس ہو سکتا ہے، نہ ماحول کے متعلق محسوسات بے آمیزش اس تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہر دو سر مشغلہ اس لطافت و نظافت میں کم یا زیادہ کثافت پیدا کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غیب سے جو کچھ قلبِ دماغ پر وارد ہوتا ہے، وہ کامل جلوہ گری کے کمالات نہیں دکھا سکتا۔ یہ نکتہ تفصیل کا محتاج ہے، مگر میں ضمنی مباحث میں رشتۂ بیان پھیلا کر تعارف کو گرانبار نہیں بنانا چاہتا۔

میں نے ندیم کے مجموعہ ہائے کلام ایک سے زیادہ مرتبہ بہ دقتِ نظر پڑھے اور اس مجموعے کے بعض حصوں سے بھی لطف اندوز ہوا، جو اب منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اس طرح ان کا اسلوبِ فکر و نظر لوحِ ذہن پر مرتسم ہوتا رہا اور شروع ہی سے ان کے متعلق میرا جو احساس تھا، وہ حقیقتِ ثابتہ بن گیا۔ اب میں اپنی استعداد کی حد تک پورا اندازہ کر چکا ہوں کہ جن تاثرات سے ان کا سینۂ صافی معمور ہے، انھیں وہ کس انداز میں پیش کرتے ہیں؟ ان کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں؟ وہ جس ماحول میں پیدا ہوئے، پرورش پائی، ہوشمندانہ زندگی کے بیشتر اوقات بسر کیے، اس سے وہ کس کس رنگ میں کس حد تک متاثر ہوئے؟ پھر ان تاثرات کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر نغمہ و ترنم کا سروسامان کیونکر کیا؟

کوئی شاعر، جسے شعر گوئی سے کچھ بھی فطری مناسبت ہے، ماحول سے بے تعلق اور غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔ گرد و پیش کا ہر منظر، ہر واقعہ اور ہر سانحہ اس پر کم یا زیادہ اثر ڈالنے لگتا ہے۔ یہی تاثرات اس کی فطری کارگاہِ شعر میں نظم یا غزل یا قطعہ یا رباعی یا مثنوی کی شکل اختیار

کر کے ہمارے سامنے جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ شعر کی خوبی کا مدار و انحصار اوّلاً اس پر ہے کہ قدرت نے شاعر میں ماحول سے متاثر ہونے کی صلاحیت کس مقدار میں ودیعت کی ہے۔ ثانیاً وہ ان تاثرات کو کتنے دلنشیں، پُرتاثیر اور ولولہ انگیز انداز میں پیش کرنے پر قادر ہے۔ یعنی خود ماحول سے متاثر ہو کر ماحول کو متاثر کرنے کی استعداد کا کیا عالم ہے۔ اسی تاثر و تاثیر، اسی فعل و انفعال اور اسی انجذاب و اندفاع یا داد و تسدید پر شاعر کے مقام و مرتبہ کا انحصار ہے۔

شعراء کو متعدد طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تفصیل کا موقع نہیں، البتہ اجمالاً عرض کر دینا چاہیے کہ بعض اصحاب کو مشاہدات و محسوسات کے بجائے تخیل سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور وہ بلند پروازی کی تڑپ میں گرد و پیش سے بڑی حد تک بے پروا ہو جاتے ہیں۔ بیشک انھیں زبان کی تراش خراش، الفاظ کے حسن، موزونیت اور مناسبت، بندش کی چستی، تراکیب کی دلآویزی اور محاورات کی برجستگی کا خاص خیال رہتا ہے۔ اسی طبقے میں سے بعض افراد اُن حدود سے ایک قدم بھی باہر رکھنا گناہ سمجھتے ہیں، جو اساتذہ کے کلام میں متعین ہو چکے، یہاں تک کہ نئی تشبیہوں یا جدید اسالیب بیان کو بھی گوارا نہیں کرتے۔ کہہ دیتے ہیں کہ اساتذہ کے ہاں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ ایک خاص دائرے میں جو فطری نہیں بلکہ خود ساختہ ہے، اپنے آپ کو مقید کر لینا جمود پیدا کرتا ہے۔ تاہم اس طبقے نے زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ہمارے اساتذہ کا بڑا حصہ اسی طبقے سے متعلق ہے، مگر زبان و ادب بھی غیر فانی نہیں، نامی اجسام ہیں۔ ان میں بھی نئے نئے طرق و اسالیب کی راہیں کھلی رہنی چاہئیں۔ مدعا یہ نہیں کہ اُن تقیدات سے بھی کلّی بے اعتنائی اختیار کر لی جائے، جن کے بغیر کوئی زبان بہ لحاظ زبان محفوظ نہیں رہ سکتی اور ہر فرد کو حدیں پھاندنے کی کھلی اجازت دے دی جائے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ زبان و ادب کے اندر نشو و ارتقاء کے جتنے بھی ممکنات موجود ہیں، انھیں بروئے کار آنے دیا جائے گا، تو زبان ترقی کرے گی، ورنہ پہلے سمندر کے بجائے وہ ایک جوہڑ بنے گی، پھر یہ جوہڑ بھی رفتہ رفتہ خشک ہو جائے گا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ان اساتذۂ کرام کی گراں بہا خدماتِ زبان و ادب سے قطعاً اعراض نہیں کیا جا سکتا، مگر شاعری کے جو حقیقی وظائف ہیں، میرے نزدیک ان کے ذریعے

سے پورے نہ ہو سکے یا کہہ لیجیے کہ کما حقہٗ پورے نہ ہو سکے۔ شاعری کا وظیفہ میرے اندازے کے مطابق بہت اہم ہے اور اس کا صحیح اندازہ عموماً نہیں کیا جاتا۔ اس وظیفے سے وہی باکمال اصحاب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، جو ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے ٹھیک ٹھیک متاثر ہوں اور ان تاثرات سے ماحول کی اچھائیاں اُبھارنے اور خرابیاں دور کرنے کے لیے مؤثر طریق پر مسلسل کام لے سکیں۔ وہ اپنے رنج و راحت کے محدود دائرے سے نکل کر گرد و پیش کے رنج و راحت سے دلبستگی پیدا کریں۔ جس طرح ایک سلیم الحواس انسان رنج سے گریزاں رہتا ہے اور راحت کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے، اسی طرح شاعر کو بھی گرد و پیش کے رنج سے متألم اور گرد و پیش کی راحت سے مسرور ہونا چاہیے۔ تخیل یقیناً شعر کی جان ہے، مگر وہی تخیل جس کی بنیادیں گرد و پیش کے حالات و مشاہدات اور محسوسات و تأثرات پر قائم ہوں۔ جس شاعر کا قلب و دماغ عالمِ انسانیت کی نبض کے ساتھ متحرک نہ ہو وہ اپنا حقیقی وظیفہ انجام نہیں دے سکتا۔ غالب کے الفاظ میں شاعر وہ ہے، جو مخلوق کی آنکھوں میں آنسو گن لینے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہو اور سینوں میں آہ و فغاں کی تڑپ دیکھ سکے۔ پھر ان آنسوؤں اور اس آہ و فغاں کی مؤثر چارہ گری کے لیے زبردست حرکت پیدا کر سکے۔

اس سلسلے میں شعراء کے درجات متفاوت ہیں اور ان درجات کا انحصار ہر شاعر کے احساس کی شدت، تخیل کی ندرت اور طرزِ بیان کی تاثیر کے درجات پر ہے۔ ایک سی واقعہ ہوتا ہے، مگر مختلف لوگ اس سے مختلف طریق پر متاثر ہوتے ہیں اور ان تاثرات کو پیش کرنے کا طریقہ بھی سب کا یکساں نہیں ہوتا۔ بعض ہنگامی تاثرات محض پیش کر دینے پر قناعت کر لیتے ہیں، بعض ان تاثرات کی بنا پر مصائب کے مستقل ازالے کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

میرے نزدیک اصل فطری شاعر وہی ہیں، جو زندگی کا ایک مستقل مقصد و نصب العین رکھتے ہیں۔ قدیم کا تعلق اسی زمرے سے ہے، جس کے افراد پہلے بھی کم رہے اور آج بھی کم ہیں۔ ظاہر ہے کہ نادر و کمیاب شے کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہونی چاہیے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اور نکتے کی بھی تھوڑی سی وضاحت کر دوں، جس کے متعلق اکثر اصحاب کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ ہمارے مشہور و بلند مرتبہ شعراء میں سے

بیشتر ایسے ہیں جنھیں اپنی زندگی میں بھی انتہائی قدر و منزلت حاصل رہی تاہم وہ برابر قدرناشناسی کے شکوے کرتے رہے۔ غالب، نظیری، عرفی بلکہ اقبال تک کے کلام میں شکوے کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ بعض شعرا میں اس شکوے کو فخر و غرور پر محمول کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں۔ شکوے کی ایک وجہ یقیناً یہ ہے کہ اُن کے ذہنوں میں زندگی کے نصب العین کی عظمت کا جو احساس تھا، ماحول میں اس کے لیے ویسی تڑپ کہیں نہ پائی گئی جیسی پائی جانی چاہیے تھی۔ دوسری اور اہم تر وجہ یہ ہے کہ یہ شکوہ بجائے خود اصل دعوت ہی کا ایک طریقہ ہے، یعنی وہ اس طریقے سے دُنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ ان کے پیشِ نظر نصب العین کے لیے جتنا جذبہ پیدا ہونا چاہیے، اتنا پیدا نہیں ہُوا اور جذبے کا مطلوب درجہ حاصل کیے بغیر نصب العین کی تکمیل صورت پذیر نہیں ہو سکتی۔ یعنی یہ بھی نصب العین کی تبلیغ ہی کا ایک ذریعہ ہے، مگر عام اصحاب اسے انفرادی شکوہ قرار دے کر غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر شاعر کی شعر گوئی کو فی الجملہ تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پہلے دَور میں بھی تاثرات کی کمی نہیں ہوتی، لیکن تمام تاثرات واضح اور نمایاں نہیں ہوتے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک مشاق رباب نواز کی مضراب تاروں پر سرگرم ورزش ہوتی ہے تو اس سے دلکشا اور روح افروز نغموں کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔ اُسی مضراب سے کوئی نوآموز کام لے گا تو تاروں سے آوازیں ضرور نکلیں گی، مگر ان میں وہ ترتیب و تنظیم نہ ہو گی جس سے نغمے ترکیب پاتے ہیں۔

اسی طرح فکری صلاحیت ان تاثرات سے ٹھیک ٹھیک کام نہیں لے سکتی اور زبان پر بھی شاعر کو پوری قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ غرض اس دَور میں فطری شاعر بھی جو کچھ کہے گا، وہ خامیوں سے پاک نہ ہو گا۔ خیالات و احساسات اتنے معین اور واضح نہیں ہوتے کہ دلوں پر پائدار اثر چھوڑیں یا ان میں اعلیٰ درجے کی گیرائی اور جاذبیت ہو۔ اسی طرح ہر خیال کے اظہار کے لیے موزوں الفاظ کا انتخاب بھی ناپید نظر آئے گا۔ اس دور میں شاعر عموماً فکر و احساس کی کم مائگی یا شعور کے ضعف و نارسائی کی تلافی الفاظ کی فراوانی سے کرتا ہے۔

۲۔ دوسرے دَور میں فکر و احساس اور الفاظ و اسلوب کے درمیان اگرچہ توازن

پیدا ہو جاتا ہے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے، وہ معناً بھی قیمتی اور وزنی معلوم ہوتا ہے۔ اسلوبِ بیان میں بھی زیادہ صفائی، شستگی، روانی اور انسجام نمایاں ہو جاتا ہے۔

۳۔ تیسرے دور کی شعر گوئی کو شاعر کی اصلی اور حقیقی شعر گوئی سمجھنا چاہیے۔ اس میں معنویت ایک بے پناہ سیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ الفاظ کی جامعیت بھی کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ بایں ہمہ الفاظ معانی کا ساتھ دیتے نظر نہیں آتے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ کے جام و سبو معانی سے بھر کر چھلکنے لگتے ہیں اور سامعہ عرفی کے بیان کے مطابق کوثر و تسنیم کی لہروں میں تیرنے لگتا ہے۔ اس آخری دور کے شعروں پر آپ گہری نظر ڈالیں تو حیران رہ جائیں گے کہ شاعر نے شعر کے ایک ایک ٹکڑے میں متعدد پہلو کیونکر پیشِ نظر رکھ لیے، حالانکہ اسے شعر کہتے وقت ان تمام مختلف پہلوؤں کا واضح شعور ہی نہیں ہوتا۔ دل و دماغ میں شعر سے جو مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، وہ بے قصد و ارادہ شاعر کی فطری خصوصیتوں کے مطابق کارفرما رہتی ہے اور دل کی بات بے تکلف کہہ چکنے کے بعد شاعر کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک شعر میں کتنے ولولہ انگیز نکتے پیدا کر گیا۔

اکثر شعرا صرف دوسرے دور تک پہنچتے ہیں اور تیسرے تک صعود و ترقی کی نوبت ہی نہیں آتی، لیکن بعض پہلے اور دوسرے دَور سے انتہائی تیزی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ گویا ان کے لیے آفتاب کا ہر طلوع و غروب ترقی و تعالی کی ایک نئی جست اور اقدامِ پیش رفت کا ایک نیا پیغام ہوتا ہے، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کو متعین کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں پہلی منزل ختم ہو کر دوسری میں قدم رکھا گیا اور کب تیسری منزل کا آغاز ہو گیا۔ کسی بڑے شاعر کے کلام کا مطالعہ بہ دقتِ نظر کیا جائے تو یہ حقائق روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے متعلق بھی میرا احساس یہی ہے کہ انھوں نے تیسرے دَور میں درجۂ کمال حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو ــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ارتقا کی دوڑ میں کس منزل پر پہنچیں گے۔ تاہم ابتدائی دوروں سے وہ ایسی برق رفتاری کے ساتھ نکل گئے کہ ان کی حدیں متعین کرنا مشکل نہیں۔

ایک اور ضروری نکتہ عرض کر دوں حقیقتہً کوئی بھی شاعر زندگی کے حقائق سے اعراض نہیں کر سکتا اور جس شعر و ادب کی بنیاد زندگی کے حقائق پر نہ ہو میرے نزدیک اسے شعر و ادب کہنا ہی مناسب نہیں۔ بعض شاعر ان حقائق سے زیادہ گہرا تعلق نہیں رکھتے، اس لیے ان کی شاعری

اُس دنیا کی شاعری نہیں رہتی، جس میں وہ زندگی گزارتے ہیں اور جس کی عکاسی یا سعیِ اصلاح میں ان کی تمام خداداد صلاحیتیں صرف ہونی چاہئیں۔ اگر ادب کی بنیاد زندگی پر قائم ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ وہ مثبت حقائق کو نظرانداز کر دے؟ کیونکر ممکن ہے کہ وہ گردوپیش نشیب و فراز دیکھے اور ہمواری کے لیے کوشاں نہ ہو؟ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ماحول میں جابجا آہ و فغاں کے سامان مہیا پائے اور اپنی قوتِ تخلیق محض تفریح و تفنن کے لیے وقف رکھے؟ کیونکر ممکن ہے کہ وہ معاشرے کو اُن بنیادوں پر لانے کے لیے مسلسل و متواتر پُرجوش و روح افروز دعوت نہ دے، جن کے بغیر توازن پیدا ہو ہی نہیں سکتا؟ توازن پیدا نہ ہوگا تو معاشرہ قائم کیونکر رہے گا؟ توازن صحت ہے، عدمِ توازن بیماری ہے، ایسی خوفناک اور مہلک بیماری، جس کا علاج کیے بغیر معاشرے کا بچنا محال ہے۔ اگر کوئی شاعر — یا زندگی کے دائرے میں کام کرنے والا کوئی صاحبِ فن — ماحول کو موجباتِ مرض کے ازالے پر آمادہ نہیں کرے گا تو لازماً اپنے وظیفے سے اعراض و تغافل کا مجرم ٹھہرے گا۔ اصل شاعر وہی ہے، جس کی شاعری کی بنیاد زندگی کے حقائق پر ہو۔

ندیم کی شاعری کا ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ اسے زندگی کے حقائق سے گہرا تعلق ہے۔ وہ کسی بھی دائرے میں کسی بھی مقام پر ان حقائق کو نہیں بھولتا، ان سے چشم پوشی نہیں کرتا، ان سے پہلو بچا کر نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ وہ پورے ماحول کو اپنے مثالی تصور کے مطابق آراستہ کرنے کے لیے بیتاب ہے۔ اسی وجہ سے اس کی شاعری میں ایسی زندہ تڑپ پائی جاتی ہے، جو دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر روحِ عمل میں ہنگامہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی مختلف مثالیں آپ کو آئندہ گزارشات میں جابجا ملیں گی۔

ندیم کی شاعری پر گفتگو سے پہلے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس ماحول میں پیدا ہوا؟ کن حالات کی آغوش میں تربیت پائی؟ اور زندگی کے ابتدائی دور میں اسے پے درپے کن تجربات سے سابقہ پڑا؟ جب تک یہ بنیادی امور پیشِ نظر نہ آجائیں، اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے اشعار جن محسوسات کی شدت سے مسلسل لبریز چلے آ رہے ہیں، ان کا سرچشمہ کیا ہے۔

ندیم نے خود "جلال و جمال" کی تمہید میں اپنے ابتدائی حالات بے کم و کاست بیان کر دیے تھے۔ اس کی پیدائش ایک گاؤں میں ہوئی، وہیں پرورش پائی۔ فطری ذکاوتِ احساس کے باعث اس

ماحول سے جو تاثرات اس نے قبول کیے، وہ کبھی دوسرے احساسات سے مغلوب نہ ہو سکے چنانچہ اس کی شاعری میں اسی فضا اور اسی ماحول کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، یہاں تک کہ اس نے اپنی شاعری کے نصب العین کے لیے جو سروسامان مہیا کیا، وہ بھی بڑی حد تک دیہات ہی کی فضا سے ماخوذ ہے اور آشنا موزوں ہے، گویا یہ خلعت صرف اسی نصب العین کے لیے تیار ہوا تھا۔

دیہات کی فضا میں حسن، جاذبیت اور دلربائی کے اسباب کی فراوانی سے ندیم غافل نہیں، مگر اہلِ دیہات کی حالتِ زار نے اسے ابتدا ہی سے حد درجہ حزین و دردمند رکھا۔ وہ کہتا ہے اور دیکھیے، کس درد و سوز اور شدتِ اندوہ سے کہتا ہے:

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس، مگر
میں نے فردوس میں اُجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

جن کو تو رستم و سہراب کہا کرتا ہے
وہ جواں میں نے یہاں خاک بسر دیکھے ہیں

میں نے گھوروں پہ پڑے دیکھے ہیں رخشندہ نجوم
میں نے لتھڑے ہوئے کیچڑ میں قمر دیکھے ہیں

میں نے پھولوں کو عفونت میں گھرا دیکھا ہے
میں نے جلتے ہوئے مٹی میں گہر دیکھے ہیں

ندیم کا کمال یہ ہے کہ وہ حالات کی تصویرکشی ہی پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ اسی تصویرکشی کو دعوتِ فکر و عمل بھی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ حقیقتاً مذکورہ اشعار میں بھی نمایاں ہے۔ مگر آگے چل کر اس کی دعوت کا رنگ زیادہ کھل گیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

میں مہاجن کی تجوری کے سمجھتا ہوں راز
میں نے دہقان کی محنت کے ثمر دیکھے ہیں

سبز کھیتوں میں مجھے زہر نظر آیا ہے
زرد خوشوں کی رداؤں میں شرر دیکھے ہیں

میں نے جو دیکھا ہے، اے کاش! وہ تو بھی دیکھے
دل کی دھڑکن بھی سنے، دل کا لہو بھی دیکھے

کہنے کو یہ چند اشعار ہیں، مگر دیکھیے، ان میں دیہات کی طبعی خوشگواریاں اور عملی پریشان حالیاں کس طرح ایک پُرتاثیر انداز سے پیش کر دی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ان پریشان حالیوں کے ختم کرنے کی پُرجوش دعوت بھی دے دی گئی ہے۔

یہ دیہاتی فضا ندیم کی متعدد نظموں کا موضوع ہے، مثلاً "میرا گاؤں"، "گاؤں کی صبح"

"گاؤں کی شام"، "چرواہے" وغیرہ دیکھیے۔ "چرواہے" ایک مختصر سی نظم ہے، لیکن اس کا رنگ سب سے نرالا اور اتنا دلکش ہے کہ حساس انسان اسے پڑھتے ہی چرواہوں پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے:

وہ بانکے ترچھے چرواہے　　یوں پھرتے ہیں میدانوں میں
جیسے رنگیلی تیتریاں　　منڈلاتی ہیں بستانوں میں
کہساروں میں لہراتے ہیں　　در آتے ہیں ویرانوں میں
موسم کے ارمان سے تولتے ہیں　　پُروائی کی میزانوں میں
انگور کی لذت پاتے ہیں　　مٹی کے مہکتے دانوں میں

کتنا دلآویز نقشہ پیش کیا ہے۔ پھر ایک ایک شعر حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ البتہ اس کا صحیح اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جنھوں نے خود دیہاتی ماحول میں کچھ وقت گزارا ہو۔ پھر چرواہوں کی خوبیاں محض اس نقشے پر ختم نہیں ہو جاتیں۔ فیشن کے غلام انسان انھیں اُجڈ اور اکھڑ سمجھتے ہیں:

لیکن یہ ان سے بڑھ کر ہیں　　مضبوط اپنے ایمانوں میں
تاریخ مرتب کرتے ہیں　　کھیتوں میں اور کھلیانوں میں
جب تک یہ گڈریے جیتے ہیں
گیتی کے گریباں سیتے ہیں

میں وسعتِ مطالعہ کا دعویٰ نہیں کر سکتا، مگر دیہات کے ایسے دلکش، حقیقت افروز ساتھ ہی اتنے دلگداز مناظر ندیمؔ کے سوا شاید ہی کہیں مل سکیں۔

ندیمؔ کی بعض نہایت نفیس نظمیں بھی دیہاتی ماحول ہی کے رنگ روغن سے مزین ہیں۔ اگرچہ ان کا نفسِ مضمون عالمِ انسانیت کے سوا کچھ نہیں۔ ان میں سے ایک نظم کا عنوان بھی خالصتہً دیہاتی ہے، یعنی "درانتی"۔ ممکن ہے کمیونزم کی اصطلاحات کے شیدائی اس کا رشتہ کہیں سے کہیں جا ملائیں مگر اصلاً ندیمؔ کی ہر چیز صرف انسانیت کی صدا لیے در دہے۔ آج دورِ حاضر کے کسی "ازم" سے کوئی علاقہ نہیں۔

چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے　　خمیدہ ہل کی یہ الھڑ جوانِ نورِ نظر

سنہری فصل میں جس وقت غوطہ زن ہوگی　　تو ایک گیت چھڑے گا مسلسل اور دراز
ندیمؔ ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز　　ستارے بوئے گئے، آفتاب کاٹے گئے

درانتی کا عمل جس طرح ازل سے جاری چلا آتا ہے، اسی طرح رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ ستارے بوئے جائیں گے، آفتاب کاٹے جائیں گے۔ ندیمؔ ایک ایسی فصل کی کاشت کا خواہاں ہے، جو روئے زمین کو بہشت بنا دے اور پوری کائناتِ انسانیت کے لیے راحت و اطمینانِ کامل کے سامان مہیا کر دے۔

ہم آفتاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے　　تو ایک روز عظیم انقلاب کاٹیں گے
ہم انقلاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے　　زمیں پہ خلدِ بریں کا جواب کاٹیں گے

دنیا کے اجارہ داروں نے زمین سنبھال لی اور انسانیت کی راحت و آسائش پس پشت ڈال دی۔ قدرت کی تیز درانتی کے دندانے چمکنے لگے تو یہ اجارہ دار تقاضائے احوال سے بے پروا ہو کر گزری ہوئی بہاروں کو دعوت دینے لگے، لیکن ظاہر ہے کہ درانتی کا عمل در رد صرف سنہری فصل تک محدود نہیں۔ کیوں؟ اس لیے:

کہ اب نظامِ کہن بھی اسی کی زد میں ہے　　خمیدہ ہل کی یہ الھڑ جوانِ نورِ نظر
جب اس نظام میں لہرا کے غوطہ زن ہوگی　　تو ایک گیت چھڑے گا مسلسل اور دراز
ندیمؔ! ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز
ستارے بوئے گئے، آفتاب کاٹے گئے

یہاں تک ندیمؔ کے ماحول اور اس کے مخصوص ابتدائی تاثرات کا ذکر تھا۔ ابتدا ہی میں اسے پے در پے شکستوں اور مایوسیوں سے سابقہ پڑا۔ ان کی ایک تصویر ہمیں اس نظم میں ملتی ہے، جس کا عنوان ہے "تسنیم کے نام":

میں نے راتوں کو اُجالوں کی دعائیں مانگیں　　اور مقدر سے گھٹا ٹوپ اندھیرے پائے
جھونکے چاہے تو غضبناک بگولے اُٹھے　　پھول مانگے تو جہنم کے پھریرے پائے
گھیر رکھا تھا جنھیں سرد و سمن نے ہر سُو　　اُن گپھاؤں میں پتنگوں کے بسیرے پائے
بجھتے ہی میں کٹیں زیست کی جتنی گھڑیاں　　نہ ستارے ہی ملے اور نہ سویرے پائے

اس سے بھی بڑھ کر مصائب کی دلدوز اور دل سوز تر تصویر ذیل کے شعروں میں پیش کی ہے:

نیا کھوں کتنی گھٹاؤں کے نچوڑے دامن — کشتِ احساس پہ اک بوند بھی ٹپکا نہ سکا
میں وہ تلوار ہوں جو رقص کی پیاسی ہی رہی — میں وہ پرچم ہوں جو طوفاں میں بھی لہرا نہ سکا

یہ آتشیں ترانے جن زخموں کی نشاندہی کر رہے ہیں وہ کسی تفصیل و تشریح کے محتاج نہیں، تاہم کوئی مصیبت، کوئی پریشانی، کوئی رکاوٹ ندیم کو اس راستے سے ہٹا نہ سکی جو قدرت نے اس کے لیے مقدر کر رکھا تھا اور یہی اس کے فطری شاعر ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

میں جس حد تک اندازہ کر سکا ہوں ندیم کی شاعری کا بنیادی موضوع وہ انسانیت ہے جو رنگ، نسل، خون، جغرافیائی حدود، منصب، ثروت، غرض ہر مصنوعی امتیاز سے بالاتر ہے، وہ انسانیت جس کے لیے غالب نے کہا تھا:

ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست
بہ گردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

وہ آدم، وہ انسان جس کی برتری کے ترانے ہر سازِ وجود سے بلند ہوئے جسے اقبال جیسے رازدانِ حکمت و دانش نے وظائف میں نوریوں سے بھی اشرف و اعلیٰ قرار دیا:

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر — ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازیہا — شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

"بیش ازاں" تو کہہ دیا، مگر اس کی حد و نہایت معین نہ کی کیونکہ انسان میں فطرت نے جو امکانات رکھ دی ہیں، ان کی کوئی حد معین ہو ہی نہیں سکتی۔ وہی آدم جس کے لیے غالب نے کہا تھا:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

یہ تعلّی نہ تھی، حقیقت تھی۔ وہ آدمی جس کی بارگاہ میں اللہ تعالیٰ کو فرشتے کی گستاخی پسند نہ تھی، اس کے لیے ہوا و ہوس کے بندوں نے ایسے عزت رُبا نظام تیار کر دیے کہ اس کی عظمت و برتری خاک میں مل گئی اور وہ بے دست و پا ہو کر ذلت کا پیکر رہ گیا۔

ندیم نے صرف انسان اور انسانیت سے محبت کا پیمان استوار کیا۔ وہ کسی خاص رنگ، خاص نسل اور خاص ملک کے انسان نہیں، بلکہ پورے عالمِ انسانیت کے تقاضوں کو زندگی کے اہم ترین فرض سمجھتا ہے اور دیکھیے یہ حقیقت کتنے سادہ، مگر کس درجہ پُرتاثیر انداز میں پیش کرتا ہے:

تم نے افراد سے پیمانِ محبت باندھا
آدمیت کے تقاضوں کا وفادار ہوں میں

کوئی شخص انسانوں سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ وہ بلند عہدوں پر فائز ہیں اور ان سے مادی فائدہ پہنچے گا۔ کوئی دولت کا پجاری ہے اور دولتمندوں سے رشتۂ الفت جوڑتا ہے۔ کسی نے ہم مشربوں کی حد بندی کر لی ہے اور اپنا پیار انھیں تک محدود رکھتا ہے۔ اس حد سے باہر ہر گروہ سے بیزار یا کم از کم بے تعلق رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی محبت روئے زمین پر امن و اطمینان کی وہ بہشت پیدا نہیں کر سکتی، جو انسانوں کے قلب و روح کے لیے قدسی آسودگی مہیا کر دے۔ صرف آدمیت کے تقاضوں کی پابندی ہی ایک مثالی نظام بروئے کار لا سکتی ہے، جس میں تمام انسان ایک جدِ امجد کی اولاد، ایک بزرگ کی نسل اور ایک بڑے گھرانے کی شکل میں زندگی بسر کریں۔ ندیم کا نصب العین یہی انسانیت اور یہی آدمیت ہے۔ اس نے شعر کی شکل میں جو کچھ کہا، مقصد و نصب العین اس کے سوا کچھ نہ تھا، البتہ کہیں وہ اس کے لیے براہِ راست دعوت دیتا ہے، کہیں انسانیت کے کسی صد درجہ مظلوم طبقے کے لیے درد بھرے نوحے لکھتا ہے، کہیں جوشِ عمل کی صدا لگاتا ہے، کہیں کہتا ہے کہ رات اندھیری ہے تو ہو، منزلِ مقصود دور ہے تو منافقت نہیں، صبحِ امید ضرور طلوع ہو گی۔ اس طلوع کو کوئی بھی طاقت نہیں روک سکتی:

نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امنڈتی رہے — مگر یقینِ سحر ہے جنھیں، اداس نہیں
افق دھڑک تو رہا ہے سجھائی دے کہ نہ دے — شفق ابل تو رہی ہے دکھائی دے کہ نہ دے
گلوں پہ اوس شعاعوں کے انتظار میں ہے — کہ اس کے حسن کی عظمت کرن کے پیار میں ہے

اسی طرح ستارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے جائیں گے۔ ٹوٹتے جائیں گے اور صبح بہرحال طلوع ہو گی، اسے کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ اس کا طلوع قانونِ قدرت کے تابع ہے، جس کا عمل اس وقت تک برابر ایک رفتار پر جاری رہے گا جب تک مشیّتِ ایزدی اس نظامِ کائنات کو

برقرار رکھے گی۔ چلنے والوں کا کام صرف یہ ہے کہ چلتے رہیں اور :

نجوم بجھتے رہیں، تیرگی اُمنڈتی رہے
سحر کا تو کسی ذی نفس کے پاس نہیں

یہ پیام اُمید بھی انسانیت کے اسی دور اور عہد سے تعلق رکھتا ہے، جو بہرحال آئے گا اور انسانوں سے کالے گورے، شرقی غربی، عربی، عجمی کی حیثیت میں نہیں، بلکہ صرف انسانوں کی حیثیت میں پیار کیا جائے گا، گویا افراد سے پیمانِ محبت نہیں بندھے گا۔ آدمیت کے تقاضوں سے حق وفا ادا کیا جائے گا۔ اقبال نے ۱۹۰۸ء میں یہی پیغام دیا تھا۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا، جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

"جلال و جمال" میں "کھیل" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے۔ اس میں پورا ماحول دیہاتی ہے، لیکن اصل میں وہ بھی انسانیت ہی کی پکار ہے اور دیکھیے کتنی پُرتاثیر ہے:

دھرتی کا جو سینہ چیرے، آخر منہ کی کھائے زر کی خاطر خون بہائے، لیکن خاک نہ پائے
جگ کی جھولی بھرنے والا اور دامن پھیلائے ہرے بھرے کھیتوں کا آقا اور فاقوں مر جائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

گاؤں کے البیلے، بانکے، مستانے متوالے بھولی بھالی دہقانی ماؤں کی گود کے پالے
جن کے ساتھی جیت کے جھونکے اور ساون کے جھالے اُن کو ایک غلیظ مہاجن ہتھکڑیاں پہنائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

زریں ٹیلے، مست کھجوریں، خاموشی، رعنائی پھٹے پُرانے خیمے یعنی یہ قریۂ صحرائی
جب اِن پر چھا جاتے ہیں تہذیبوں کے سودائی دھرتی ماتا چلاتی ہے "میں لٹتی ہوں، ہائے"
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

یہ انسانیت کے ایک بہت بڑے طبقے کی دردناک اور دل کو چیر ڈالنے والی تصویر تھی۔ ندیم آخر میں رفیقوں کو پیغام دیتا ہے کہ آزادی پر مرنے کے دعوے کرتے ہو اور قید و بند سے ڈرتے ہو؟ ساتھ ہی مختلف طبقوں کا نقشہ کھینچتا ہے جو بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں، یعنی عوام کے

تنخواہ دار خدمتگار ہیں، مگر من مانی کرتے ہیں۔ خود ہی ناحق کوششوں اور بے انصافیوں سے عوام میں جوش و اضطراب کی آگ لگاتے ہیں، پھر اس کے لیے دوسروں کو ملزم ٹھہراتے ہیں، شاعر ہو کر بھانڈوں کی طرح اربابِ ثروت و اقتدار کے گُن گاتے ہیں۔

آزادی پر مرنا، لیکن زنجیروں سے ڈرنا بڑی بڑی تنخواہیں پانا اور من مانی کرنا؟
خود ہی آگ لگانا اور الزام کسی پر دھرنا؟ شاعر اور بھانڈوں کی طرح تو ابروں کے گُن گائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

غرض انسانیت اس کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے، بلکہ ایک ہی موضوع ہے، باقی اس کے حوالی و ظروف ہیں۔ وہ ہمدموں کی برق رفتاری دیکھتا ہے تو درد و سوز سے کہتا ہے کہ میں انسانیت کے قافلے کو پیچھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میرے دُکھ سُکھ کی ہر شے ان سے وابستہ ہے اور ان سے بے تعلق ہو کر آگے نکل جانے سے دل کے زخموں کا علاج نہیں ہو سکتا۔ دُکھ دور نہیں کیے جا سکتے۔ مجھے بھی محبت کے کئی افسانے یاد ہیں، لیکن احساس کے زخم تازہ ہوں تو وہ افسانے کیونکر سناؤں جو راحت و دلجمعی کی ایک تفریح ہیں:

وہ حکایت جو سناؤں سنے سنانی مجھ کو اپنی محفل کے چراغوں کو جلاؤں تو کہوں
مدعا ذہن میں محفوظ کیے بیٹھا ہوں سننے والوں کو خماروں سے جگاؤں تو کہوں

ذوقِ پرواز بھی ہے حسرتِ پرواز بھی ہے ساتھ دیتا ہے مگر مجھ کو تھکے ہاروں کا
کیسے پلکوں کو چلا آتا ہے دامن تھامے ایک انبوہ سسکتے ہوئے بیماروں کا
برق گامی کے ہیں قربان، ذرا تھم کے چلو قافلہ رینگتا آتا ہے دل افگاروں کا
ہم سفر چُور ہیں، تم دور اُڑے جاتے ہو
یہ رویّہ تو مداوا نہیں آزاروں کا

یعنی انسانیت کا تقاضا یہ نہیں کہ عوام کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤ، انھیں ساتھ لے کر چلنا چاہیے اور بہرحال ان کی رفاقت کا حق ادا کرنا چاہیے۔

یہ بھی دیکھیے کہ ندیم کے ذہن میں انسان کا تصور کتنا بلند اور کس قدر رفیع ہے! پھر اس

تصور کو کس درجہ سادہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے :

آدمی شش جہات کا دولھا
وقت کی گردشیں براتی ہیں

اس ایک شعر میں انسان کے شرف و عظمت کی جو تصویر کھینچی ہے، اس کی مثالیں بہ آسانی نہیں مل سکیں گی۔

وہ ایک نظم میں انسان کے کارنامے بیان کرتا ہوا کہتا ہے کہ وہی انسان جو بہشتوں کا لاڈلا اور فرشتوں کا مسجود تھا، جسے جرمِ محبت کی سزا ملی تو کائنات کے بے آب و گیاہ صحراؤں میں بہار کا منظر پیدا ہو گیا، کیونکہ یہ کائنات صرف انسان کی محنت سے آراستہ ہوئی۔ وہی انسان جس نے فرش پر عرش کا سا جمال پیدا کر دیا۔ جس نے آتش و آب و خاک و باد کے خوفناک طوفانوں کو خس کر ٹال دیا :

بڑھا تو راہیں تراشیں، رُکا تو قصر بنائے
اُڑا تو گیت بکھیرے، جھکا تو پھول کھلائے

آج اسی انسان کی ہنسی اُڑائی جا رہی ہے :

نہیں، کسی سے بگڑنا مرا سبھاؤ نہیں — مری سرشت میں گلزار ہیں، الاؤ نہیں
ہزار بار شکستوں پہ مسکرایا ہوں — مصیبتوں کی گرج میں بھی گنگنایا ہوں
خدا شناس بھی ہوں اور خود شناس بھی ہوں — خدا سے دور بھی ہوں اور خدا کے پاس بھی ہوں
یہاں زمیں پہ بھی تخلیق کام ہے میرا — کہ کبریائی سے منسوب نام ہے میرا

خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دولھا ہوں میں، ندیمؔ ہوں میں

دیکھیے، انسان کی یہ کتنی پاکیزہ تصویر ہے! یہ تصویر بھی ہے اور انسان کے لیے صحیح راستے کی دعوت بھی ہے۔

غرض ندیمؔ کی اکثر نظموں میں انسانیت کے کسی نہ کسی دکھ کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور انسان کو اشرفیت کے مقامِ بلند پر پہنچانے کی تڑپ سے اس کے قلب و روح معمور ہیں۔ اس نے

مختلف صورتوں میں اپنے یہ پُرسوز جذبات نہایت مؤثر انداز میں پیش کیے ہیں۔ مثلاً :

میرا غم صرف مرا غم تو نہیں، کم کیوں ہو — آدم اس دور میں بھی کشتۂ آدم کیوں ہو
آدمیت ہی جب اس دور میں پامال ہوئی — اپنی اک ذات کے لٹنے کا مجھے غم کیوں ہو

یعنی وہ غم کو کسی ذاتی ضرر یا تکلیف کا نتیجہ نہیں سمجھتا کہ اس میں موجباتِ تکلیف کے دور ہو جانے یا گھٹ جانے سے کمی آ جائے۔ وہ تو انسانیت کا غم لیے بیٹھا ہے، اور جب تک انسان انسان کے ہاتھوں ستم رسیدہ ہے، ندیمؔ کے غم میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔

پھر وہ محض اظہارِ غم پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ ہمسروں اور رفیقوں کی حوصلہ افزائی کے لیے امید کا یقین افروز پیغام دیتا ہے :

سینۂ شب میں دھڑکتا ہے دلِ صبحِ جمال — لب ترے خشک ہیں کیوں، آنکھ تری نم کیوں ہو
چیتھڑا کا زخم نہیں ہے کہ ندامت ہو تجھے — زخم سینے کا ہے شرمندۂ مرہم کیوں ہو

جب وہ دیکھتا ہے کہ ہر طرف سے نئے دَور کے درود کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں تو وہ اس کے آثار و علائم تلاش کرتا ہے، تاکہ یقین ہو جائے، نیا دور واقعی آ گیا، کیونکہ دن نکل آنے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ سورج کی روشنی سے ہر طرف اُجالا ہو جائے۔ افسوس کہ ہر طرف اس کی آنکھیں قدیم مناظر سے دوچار ہوتی ہیں۔ چند خود غرض اور عوامی حقوق کے غاصب انسانوں نے عالی شان قصر بنا رکھے ہیں اور ان کے سائے میں لاکھوں عوام مختلف امیدیں لیے ہوئے جمع ہیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی وہ پکار اُٹھتا ہے کہ نیا دور کہاں آیا؟ یہاں تو پرانے ہی مناظر پھیلے ہوئے ہیں :

اب بھی انسان ہے اسباب و نتائج کا اسیر — قصر کے سائے میں اب تک ہے وہی جمِ غفیر
وہی جینا ہے مصیبت، وہی مرنا ہے حرام

وہ ہر انسانی صلاحیت کو صرف انسانوں کی بہبود اور زندگی کی آرائش و زیبائش کے لیے وقف رکھنے کا معتقد ہے اور کہتا ہے :

یہ رقص و نغمہ، یہ شعر و ادب، یہ حکمت و فن
حیات کُش ہیں، نہیں ہیں اگر حیات افروز

فن کے دو ہی پہلو ہیں۔ یا تو وہ زندگی کے بہتر سے بہتر طور طریقے انسانوں کے رُوبرو

واضح کرتا ہے یا وہ زندگی کے لیے سمِ قاتل ہے۔ اگر وہ دونوں میں سے کچھ بھی نہیں تو بیکار محض ہے۔ فرض کر لیجیے کہ کسی نے فن کو کمال پر پہنچا دیا، لیکن اگر اسے زندگی سے گہرا ربط و تعلق نہیں تو وہ صرف تصور کا ایک افسوں ہے، محض خیالات کا ایک طلسم ہے۔ مان لیجیے کہ یہ فن رفعت میں آسمان کے ستاروں کا درجہ حاصل کر گیا، لیکن اگر اُن ستاروں کی جلوہ گری زمین کو منور نہیں کر سکتی اور یہاں کی تیرگی کو دھو نہیں سکتی تو اُن سے کیا حاصل :

نکل کے ابر سے جو کہر میں اُتر جائے
اُس آفتاب کے طالب نہیں مرے شب و روز

پھر کہتا ہے :

وہی کرن ہے کرن ارتقا کی نظروں میں — جو گُل کے ریشۂ گل میں نفوذ کر جائے
جو رنگ بن کے سما جائے بند کلیوں میں — جو آگ بن کے رگِ سنگ میں اُتر جائے
جو آبجو پہ گرے عکس بن کے تاروں کا
جو اوس بن کے لبِ آبجو بکھر جائے

یعنی اسے صرف وہی حُسن، وہی آب و تاب، وہی درخشانی مطلوب ہے جس کی جلوہ کاریاں اور ضیا باریاں صرف بلندیوں تک محدود نہ رہیں، بلکہ ذرّے ذرّے زمین پر روشنی کا سرو سامان مہیا کر دیں۔ وہ تمام ہم فنوں کو مختلف طریقوں پر یہی دعوت دیتا ہے :

کھیت آباد ہیں دیہات میں اُجڑے اُجڑے
اس تفاوت کا مٹانا بھی تو فن کاری ہے

سوئی ہوئی کس دُھن میں ترّی غیرتِ فن ہے
جاگا ہوا انساں بھی تو موضوعِ سخن ہے

وہ نسل و رنگ کے تفرقوں سے بیزار ہے۔ یہ چیزیں اسے انتہائی دکھ پہنچاتی ہیں۔ کس دلی تڑپ سے کہتا ہے :

ابھی نسلوں کے اک انبوہ میں محبوس ہیں ہم — آدمیت کے تقاضے نہیں بیدار ابھی

سہمے ہوئے پژمردۂ حریتِ فکر سنانے والو — کتنے منصور ہیں موجود سرِ دار ابھی

قرآن مجید میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو دکھائی مگر کسی نے اسے نہ اٹھایا اور ڈر گئے۔ انسان نے یہ امانت اُٹھالی۔ خواجہ حافظ شیرازی کا مشہور شعر ہے :

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

ندیمؔ نے اس سے ایک عجیب مضمون پیدا کر لیا۔ وہ کہتا ہے :

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیمؔ! تم اس بوجھ کو سہار و بھی

مطلب یہ کہ انسان نے کائنات کا بوجھ تو بے تکلفی سے اُٹھا لیا، مگر اسے سہار نہ سکا اس کے اٹھانے کا حق ادا نہ کر سکا اور قانونِ فطرت کی پے در پے خلاف ورزیوں سے دنیا کو جہنم زار بنا دیا۔ بوجھ کے سہارنے کا مطلب یہی تھا کہ جو ذمہ داری سنبھالی تھی، اسے بوجہ احسن پورا کیا جاتا۔ یہ نہ ہُوا تو سمجھ لینا چاہیے کہ بوجھ سہارا نہ گیا۔

انسانیت ہی کی تڑپ نے ندیمؔ سے بعض نہایت دلآویز اور صد درجہ پُرمعانی اشعار کہلوائے، جن کی تشریح کے لیے دفتر درکار ہیں، مثلاً :

ندیمؔ! فلسفۂ صبر کو دعائیں دیں
بر ایں غریب کُشی جو رہے غریب نواز

یعنی جن لوگوں نے غریب کُشی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، انھیں نام مساکین بیچارگی کے باعث "غریب نواز" کہتے رہے۔ یہ صورتِ حال کیوں رونما ہُوئی؟ صرف اس لیے کہ مسکینوں اور غریبوں کو صبر کی تلقین کی گئی۔ انھیں فلسفۂ صبر سمجھا دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد پر آمادہ نہ ہُوئے۔ جنھیں غریب کُشی کے باوجود غریب نواز کہا گیا انھیں چاہیے کہ فلسفۂ صبر کو دعائیں دیں۔

اب میں اس موضوع کے متعلق زیادہ شواہد پیش نہیں کروں گا، البتہ چند اشعار شاہدِ ثنا

ضروری ہے جن سے ندیم کی انسانیت دوستی پر زیادہ سے زیادہ روشنی پڑتی ہے :

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریبِ شہر نہیں

انسانی سرشت کے اصلح اور پاک ہونے کی تلقین خود اسلام نے کی ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ بچہ اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، مگر والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا لیتے ہیں۔ ندیم بھی انسانی سرشت کی پاکیزگی کے سلسلے میں اسی اسلامی عقیدے کا داعی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی سرشت کے متعلق یہی یقین نسل اور نسب کے بکھرے ہوئے اوراق کی شیرازہ بندی کر سکتا ہے یعنی مختلف نسلوں میں بٹے ہوئے لوگ ایک نسل کے معتقد بن سکتے ہیں، کیونکہ سب کے جدِ امجد آدمؑ ہیں۔ یہی یقین ندیم کے خلوص اور وقار کی بنیاد و اساس ہے۔ یہی اس کا ادب اور یہی اس کا مذہب ہے۔ اسی کو وہ عقل و شعور کا اوجِ کمال سمجھتا ہے :

یہی یقین کہ انساں کی جبلت میں   بہ ایں شکستہ دلی آشتی ہے، قہر نہیں
وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر   کسی بھی شہر میں جاؤں غریبِ شہر نہیں

اس سلسلے کی ایک نہایت پُر تاثیر اور لبریز حقائق نظم وہ ہے جسے "شعلۂ گل" میں "نغمۂ انساں" قرار دیا گیا ہے :

اس خراب آباد میں مثلِ بہار آئیں گے ہم   بادۂ پُرزور رنگ بیز و نغمہ بار آئیں گے ہم
کوہساروں سے برنگِ آبشار آئیں گے ہم   اور میدانوں میں بن کر برگ و بار آئیں گے ہم

وہ کہتا ہے کہ زندگی کی عروس میں دلربائی ہمارے دم سے ہے۔ کارگاہِ زیست میں ہنگامے ہماری ہی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں ہیں جنھوں نے جذبۂ تخلیق سے ستاروں تک رسائی حاصل کر لی :

ہم نہ ہوں تو اس طرح اُجڑے خدائی کا سہاگ
جس طرح خرمن میں بجلی، جس طرح جنگل میں آگ

ہم نے دھرتی کے کلیجے میں نمو پیدا کیا   ہم نے مٹی کے مرکب سے سبو پیدا کیا
خوشۂ انگور سے ہم نے لہو پیدا کیا   ہم نے یہ ہنگامۂ رنگ و بُو پیدا کیا

گو عناصر چیختے، چلّاتے، غرّاتے رہے
ہم ضمیرِ زندگی میں جذب ہو جاتے رہے

ہم نے دھوئی چہرۂ آفاق سے گردِ ملال   پربتوں پر ہم نے ڈالے گھومتی راہوں کے جال
ہم نے صحراؤں کو بخشا سبزہ زاروں کا جمال   ہم نہ ہوتے تو کسے تھی بحر گردی کی مجال

ہم نے ناپیدا کرانی کے کنارے پا لیے
خاک کے ذروں کو یوں چھانا ستارے پا لیے

جب اللہ کا کوئی بندہ نیا پیغام لے کر اُٹھتا ہے تاکہ عالمِ انسانیت کو اندوہ و غم سے نجات ملے، اس کی مصیبتیں ختم ہو جائیں اور وہ راحت کی زندگی بسر کرنے لگے تو داعی کو شدید کشمکشوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ندیم کو بھی یہ منزل پیش آئی، چنانچہ وہ کہتا ہے :

جذبۂ دل نے کہا، جرأتِ فغاں نہ کر   میرا ماحول پکارا کہ گنہگار نہ بن
میں نے جب عشق کے فانوس جلانے چاہے   تو عزیزوں نے صدا دی کہ شبِ تار نہ بن
تنکے گلیوں سے اُٹھائے تو یہ آواز آئی   چشمِ احباب میں اس درجہ سبکسار نہ بن
آتشیں گیت سُنے، سُن کے بزرگوں نے کہا   بزمِ امروز میں فردا کا خریدار نہ بن

میرے افکار مگر مجھ سے یہی کہتے ہیں
روحِ اسلاف کی لعنت کا سزاوار نہ بن

یعنی اسلاف نے جو مسلک و مشرب پیش کیا، جس کے لیے اُنھوں نے دکھ اُٹھائے، تکلیفیں سہیں، قربانیاں کیں، اس کی دعوت نہ دوں گا تو یقیناً اسلاف کی رُوح مجھ پر لعنت بھیجے گی۔ مزید برآں :

ہم کو جو کہنا ہے، وہ کیوں نہ کہیں، کیوں نہ کہیں؟
عشقِ شوریدہ تو ہے، پھر غمِ رسوائی کیا

پھر اپنے عزم کے چہرے سے پردہ اُٹھاتا ہے :

ہم جوانی کو تہِ مذہب میں نہ گھلنے دیں گے   ہم نہ دیکھیں گے غریبوں کو غنی کا محتاج
ہم چٹانوں کے کلیجے میں علم گاڑیں گے   چشمِ اسرار میں چمکے نہیں خوش رنگ زجاج
روحِ انساں کے تقدس کو نہ ہم لوٹیں گے   ہم نہ مانگیں گے غریبوں سے غنی کا خراج
ہم نہ ڈالیں گے حکومت پہ ریا کے پردے   نہ کوئی قصر، نہ دربار، نہ کوئی تخت، نہ تاج

ظاہر ہے کہ حکومت کا مقصد مخلوق کی مشترکہ اور متحدہ بہتری کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن غرض پرستوں نے حکومت کو ہیبت ناک بنانے کی غرض سے قصر بنائے، تخت و تاج آراستہ کیے، دربان رکھے، تاکہ دیکھنے والوں پر ہیبت و دبدبہ طاری رہے اور وہ دل کی بات زبان پر نہ لاسکیں۔ حقیقتاً یہ سب ریا کے پردے تھے اور کوئی بھی حکومت، جو مخلوق کی بہتری کے لیے وجود میں آئے گی، وہ ریا کے اس سرو سامانِ جاہلیت کی روادار نہ ہوگی۔

ندیم کو اپنی منزل کے کٹھن اور جانگداز ہونے کا پورا احساس ہے، لیکن وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ محض فکر و خیال سے کوئی منزل نہ کبھی طے ہوئی ہے اور نہ آئندہ طے ہوگی۔

یہ کڑے کوس، جو تا حدِ نظر پھیلے ہیں — اک تصور سے فقط طے نہیں ہونے پاتے
شاخِ انگور پہ اُٹھے ہوئے لرزاں خوشے — آپ ہی آپ کبھی مے نہیں بننے پاتے

اس کا عزم بڑا ہی پختہ اور استوار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب روح کے آئینے پر گردِ تقلید باقی نہیں رہتی تو انسان اپنے سفینے کا ناخدا خود بن جاتا ہے:

رخشِ احساس کی ہے باگ مرے ہاتھوں میں — اب کوئی میرے خیالوں کو نہیں بھٹکاتا
نام دیتی ہے غلامی کا جسے یہ دنیا — میرے جذبات پہ وہ بھوت نہیں منڈلاتا

میں کائنات کو ایک کھلونا سمجھتا ہوں۔ اسے جس طرح چاہوں گا، گھماؤں گا۔ اس میں جو جوڑ گندھے ہوئے ہیں، انھیں پرکھنے کے لیے کبھی اسے توڑوں گا، کبھی بناؤں گا۔ مطلب یہ کہ میں جو نظام جاری کرنا چاہتا ہوں، وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو لچک اور لوچ سے عاری ہو، جس میں رد و بدل نہ ہو سکے۔ انسانیت کے لیے جو جو چیزیں مناسب نظر آئیں گی، وہ اختیار کی جائیں گی۔

میری قسمت کو نچائے گا ارادہ میرا — میرے پنجے میں سمٹ آئیں گی سب تقدیریں
گل کے بن جائیں گی حریتِ عالم کا حصار — بازوئے دہر سے لپٹی ہوئی یہ زنجیریں

جو قلوب آج منجمد نظر آرہے ہیں، ان سے بھڑکتے ہوئے شعلے اٹھیں گے جو فرسودہ نظام کو خاکستر بنا دیں گے۔

خاکبوسوں کو اُچھالوں گا فلک کی جانب
محو کر دے گا ستاروں کو بھی انساں کا مقام

وہ سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کو کامیابی کی کلید سمجھتا ہے اور رفیقوں کو بھی یہی پیغام دیتا ہے:

سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں، تم سدھار دیکھو

پھر دیکھیے، اس کا عزم کس درجہ اٹل اور اس کی ہمت کتنی بلند ہے۔ کہتا ہے:

اگر نشانِ سفر تک کہیں نہیں، نہ سہی — میں رینگ رینگ کے یہ شب نہیں گزاروں گا
شکست سے مرا اخلاق اجنبی ہے ندیم — سحر ملے نہ ملے، رات سے نہ ہاروں گا

یعنی صبحِ اُمید کا ناصیۂ جمال کتنی ہی دور ہو، میری زندگی میں اس کے ظہور کی نوبت آئے یا نہ آئے لیکن اُس نظامِ باطل کو میں قبول نہیں کر سکتا، جو انسانیت کے لیے ہزاروں مصیبتوں کا سرچشمہ بنا اور جس نے انسان کے شرف و وقار کو پامال کر ڈالا۔ اسے اپنی دعوت کی تاثیر کا بھی احساس ہے۔ کہتا ہے:

غریبوں کے گریباں کو قباؤں میں بدل ڈالا — امیروں کی قباؤں کو گریباں کر دیا میں نے
جلا کر شمعِ احساس و تفکر خانۂ دل میں — اندھیرے رہگزاروں کو چراغاں کر دیا میں نے
غرض احساس کی قندیل کو سینے میں بھڑکا کر — پھر اس بھٹکے ہوئے انساں کو انساں کر دیا میں نے

جس فرد کے احساس کا آئینہ اتنا روشن ہوتا ہے کہ اس میں ہر چیز زیادہ سے زیادہ واضح طریق پر منعکس ہو جاتی ہے، نیز قدرت اسے اپنے تاثرات انتہائی دلآویز انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت عطا کر دیتی ہے، وہ ہر حقیقت جلد سے جلد بھانپ لیتا ہے اور اسے اچھوتے اسلوب میں ڈھال کر پیش کر دیتا ہے، مثلاً مندرجہ ذیل اشعار جن حقائق کے ترجمان ہیں، وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انھیں پیش کرنے کا انداز حد درجہ سحر انگیز نہیں:

کس بھیانک تیرگی میں آ گئے — ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

سحر کا ایک ہی مفہوم ہے — طلوعِ سحر — مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں
شگفتِ گل کو تو ہے انتظارِ موسمِ گل — وہ لاکھ نوکِ سناں سے کلی کا دل چیریں
کچھ اور نام ہے اس کا، یہ فصلِ گل تو نہیں
کہ بوئے گل کے لیے ڈھل رہی ہیں زنجیریں

پھر ندیم اپنا مقصد بڑی صفائی سے بیان کر رہا ہے :

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام   ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں
ایسے غنچے بھی تو گلچیں کی قبا میں ہیں اسیر   بات کرنے کو جو اپنا ہی دہن مانگتے ہیں
فقط اس جرم میں کہلائے گنہگار کہ ہم
بہرِ ناموسِ وطن جامۂ تن مانگتے ہیں

میں نے ندیم کے کلام کی بنیادی خصوصیت تفصیل سے بیان کر دی۔ اس کے مختلف اطراف و جوانب ہیں جن کی تشریح کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو مگر وہ سب کچھ مقدمے کی تنگنائے میں نہیں سما سکتا ندیم کے کلام میں بیان کی دلنشینی، اسلوب کی دلآویزی اور استعارہ کے حسن و ندرت کی مثالیں بھی بے شمار ہیں۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ شعر خاص وضع کے الفاظ و تراکیب کا متحمل ہو سکتا ہے۔ ندیم کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسے الفاظ بھی بلا تکلف استعمال کرتا ہے جنھیں الگ کر کے دیکھا جائے تو غالباً خوش ذوق شاعر کو گوارا معلوم نہ ہوں لیکن ندیم کے طریقِ استعمال میں وہ گوارا ہی نہیں بلکہ پُرلطف بن جاتے ہیں۔ ایک اور حقیقت بھی واضح کر دینی چاہیے یعنی ندیم کے اشعار میں بے شمار ایسے الفاظ آئے ہیں جن کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں شاید ہی مل سکے۔ تاہم کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی لفظ ضرورت سے زیادہ استعمال کیا یا وزن پورا کرنے کے لیے زیادہ الفاظ سے کام لیا یا کسی لفظ و ترکیب سے شعر کی خوبی پر زد پڑی بلکہ برعکس بر خاصے کرخت الفاظ سے اس نے دقائقِ فکر و نظر جس کمال و فصاحت سے پیش کر دیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے بغیر وہ باریکیاں ٹھیک ٹھیک دلوں میں اتر نہیں سکتی تھیں۔ نظم کے الفاظ و تراکیب عموماً نثر کے مقابلے میں محدود دیکھے جاتے ہیں مگر ندیم اس حد بندی کا قائل نہیں۔ اس نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ اگر الفاظ صحیح محل پر خوبی سے استعمال کیے جائیں تو ان کی ظاہری کرختگی بھی حسنِ ادا بن جاتی ہے۔

اب میں ایک ایک مثال کی توضیح نہیں کروں گا، بلکہ یکے بعد دیگرے مختلف مثالیں پیش کرتا جاؤں گا۔ اربابِ ذوق کو ان سے میری مذکورہ بالا گزارشات کی حقیقی حیثیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

زندگی غیر مسلسل مستی   موت کا خوف مسلسل آزار
نوجوانوں کے ارادے بے رنگ   جیسے صحراؤں میں شہیدوں کے مزار

سمٹی بانہوں میں لپٹنے کی امنگ   جیسے کلیوں میں چٹکنے کا شعور
مسکراہٹ میں محبت کی کسک   تلملاہٹ میں جوانی کا غرور

مضمحل سوچ میں لپٹی ہوئی صبح   دل ربا فکر میں ڈوبی ہوئی شام

راوی کی لہروں پہ رواں ہیں قاشیں چاند ستاروں کی   کس منزل کو لپکی یہ نورانی فوج سواروں کی
چپ شبِ بھیگتے تھنتے ماہجی! تجھ کو سبک ٹانڈوں کی قسم   دھیرے دھیرے ہولے ہولے کاٹ یہ ابرو کا ساخم
یوں ہر جیسے پھول کی پتی، یوں چل جیسے سرگوشی   وقت کے اس لمحے کا تقاضا ہوشی ہے نہ مدہوشی
کھیتوں کی ہریاول پر یہ دھبے ہیں دہقانوں کے   یا گیتی نے اگلے بوسیدہ تابوت انسانوں کے
ہاریں استبدادی قوتیں لیکن کس کی جیت ہوئی ؟   یورپ کی بے رحم سیاست کب یورپ کی میت ہوئی؟
نومیدی کی کُٹیں غلطاں جگنو احساسات کے ہیں   اوس کے پرّاں قطرے ہیں یا آنسو پچھلی رات کے ہیں

زردیوں پڑ رہی تھی شمع کی لَو   حسن پر جیسے موت کا پرتو
رات جس دم جماہی لیتی ہے   دن کی آہٹ سنائی دیتی ہے
ٹوٹتا ہے جونہی کوئی ڈنٹھل   پھوٹ پڑتی ہے اک نئی کونپل
چشمِ سرشار میں حیا چمکی   ساغرِ مے میں چاندنی کی ڈلی

سست انگڑائیوں کا ایک ہجوم   بانہوں کے لوچ میں کنول کا بل

پیٹ بھرنے کے لیے حسن سے رشتہ توڑا
بیچ کر پھول خریدے کانٹے
جوئے زر میں محبت کا سفینہ چھوڑا
سیپیاں پائیں ستارے بانٹے

کنارِ آبِ رواں شبنمی شگوفوں میں — جہانِ رنگ شعاعوں کے انتظار میں ہے
ندی کی نرم روی میں نجوم اونگھتے ہیں — اُداس چاند نہاں نور کے غبار میں ہے
سحر کا یہ تقاضا کہ آفتاب اُبھرے — یہ جگنوؤں کا اک انبوہ کس شمار میں ہے

منظر اور حسنِ تشبیہ کی دلآویز مثالیں مندرجہ ذیل شعروں میں بھی نمایاں ہیں:

برق گرتی ہے جوانی کے خیالوں کی طرح — دودھیا رُوئی کے دھنکے ہُوئے گالوں کی طرح

یہ طلوعِ صبح کے آثار آتے ہیں نظر — یا دعاؤں کے لیے وا ہیں فلک کے بام و در

تاریکیوں میں دب کے لرزتا ہے بار بار — پچھم کے پربتوں پہ شفق کا حسین تار

اک ٹیس فضا کے دل میں اُٹھی — یا تیر نکل گیا کماں سے

نطق کی بغاوت پر ہونٹ پھڑپھڑاتے ہیں — جیسے نرم جھونکوں سے پھول کانپ جاتے ہیں
ڈھیر سا ہے شانوں پر بکھرے بکھرے بالوں کا — اک غبار سا جیسے ذہن میں خیالوں کا

خامشی اک طویل سوچ میں ہے — اُترے آتے ہیں برف کے گالے
چار سُو ٹوٹتے ہُوئے تارے — ہر طرف عنکبوت کے جالے
ناگہاں خامشی میں لہر اُٹھی — نیند میں جیسے کوئی کچھ گا لے
جیسی اُڈتی ہُوئی گھٹا میں ہلال — جیسے صحرا کی گود میں لالے

ساحلِ زیست پہ بکھری ہُوئی امید کی ریت — اور دمکتی ہُوئی یہ سیپیاں، ارمانوں کی

قصرِ شاہی سے گرائے گئے نیلم پکھراج — سنگریزوں کو نگلتے رہے مجبور عوام

خشک کانٹوں میں جلتے ہیں خیرات کے پھول — سوکھے جبڑوں کو جکڑتی رہی زرتار لگام
ہر نیا دور صد امید بداماں آیا — زندگی خستہ و درماندہ و مجبور رہی
اک شہنشاہ اُٹھا، ایک شہنشاہ بڑھا — اسی چکر میں ازل سے یہ زمیں چُور رہی
اک نئے دور کا پرتو ہے اُفق کی لالی — اک نئے حسن کی خاطر یہ خانہ بندی ہے
ایک ہی سطح پہ اُترے ہیں نشیب اور فراز — اب کس انسان کو دعوائے خداوندی ہے

خشک ڈھانچوں میں زمانے کے دیے جلتے تھے
جس طرح رات کو مرگھٹ میں چتا
کیڑے لگتے ہُوئے اجسام میں یوں چلتے تھے
جیسے کھپریل کے چھپر میں ہوا
کتنے محبوب تھے افلاس کے نخچیروں میں
دل میں ناسور، لبوں پر آہیں
کتنے بلبیر تھے جکڑے ہُوئے زنجیروں میں
ہاتھ روندے ہُوئے کچلی بانہیں

آپ نے آتش کا یہ مشہور شعر بارہا سُنا ہوگا:

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زرِ کفن — قاروں نے راستے میں لُٹایا خزانہ کیا

اسی بنیادی فکر نے ندیم کے ہاں یہ دلآویز صورت اختیار کی:

یہ ریت کے ذرّے ہیں کہ الماس کے ٹکڑے — گیتی نے اُگل ڈالے ہیں قاروں کے دفینے

جزا و سزا کے معاملے میں میرزا غالب نے اتنے عجیب و غریب نکتے پیدا کیے ہیں جن کی مثال شاید ہی کسی شاعر کے ہاں مل سکے، مثلاً یہ خیال کہ گناہ کا محاسبہ شروع ہُوا تو میرزا کو یاد آیا کہ کون کون سے گناہ نہیں کیے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

نیز:

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

پھر یہی خیال فارسی میں بھی ایک خاص انداز سے پیش کیا ہے:

اندر آں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت
کاشکی با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

اور مثنوی "ابرِ گہر بار" کی مناجات میں تو یہ مضمون اتنا پھیلا کر لکھا ہے کہ ہر حساس آدمی پڑھ کر تڑپ اٹھتا ہے، مثلاً:

ببخشائے بر ناکسیہائے من　　تہی دستی و درماندہ ام واے من
بہ دوشِ تر از دو سر بارِ من　　نہ سنجیدہ بگذار کردارِ من
بہ کردار سنجی میا فزائے رنج　　گرانباریِ دردِ عمرم بسنج

. . . .　　. . . . .

اگر دیگراں را بود گفت و کرد　　مرا مایۂ عمر رنج است و درد

. . . .　　. . . . .

مبادا بہ گیتی چو من ہیچ کس　　غمی دل و زہریری نفس
بہ پرسش مرا در ہم افشردہ گیر　　پرِ کاہ را صرصرے بردہ گیر
پس آنگہ بہ دوزخ فرستادہ داں　　در آتش خس از باد افتادہ داں
زدودے کہ برخیزد از سوزِ من　　شود بیش تاریکی روزِ من

پھر کہتے ہیں کہ اگر محاسبے کے سوا چارہ نہیں تو سن لے، میں نہ کافر تھا، نہ سوبج اور رات کی پرستش کرتا رہا۔ نہ کسی کو قتل کیا، نہ کسی کو لوٹا:

گرم کہ آتش بہ گوہرم از دست　　بہ ہنگامِ پرواز مورم از دست

تاہم شراب کا حساب بھی لینا ہے تو جمشید، بہرام اور پرویز سے لے:

نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ　　بہ دریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

. . . .　　. . . . .

بہ ہر جرم کز روئے دفتر رسد　　ز من حسرتے در برابر رسد

بفرمائی کیں داوری چوں بود　　کہ از جرمِ من حسرت افزوں بود

ندیم نے بھی اس باب میں ایک شعر کہا ہے جس کا طرزِ بیان بڑا ہی نادر اور دلآویز ہے۔ کہتا ہے:

جزا تو خیر، سزا کے لیے ترستے رہے　　غلام آپ کے اتنے تو بے قصور نہ تھے

خوبیِ اسلوب اور حسنِ ادا کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً:

ہم اگر دار پہ کھنچتے بھی تو اے صاحبِ دار　　اپنی ناکردہ گناہی کی قسم ہو جاتے

نہ یہ شبنم ہے، نہ بھٹکے ہوئے تاروں کا ہجوم　　رات کی لاش پہ ٹپکے ہیں سحر کے آنسو

انجمنیں اجڑ گئیں، اٹھ گئے اہلِ انجمن　　چند چراغ رہ گئے، جن کی لویں ہیں سینہ زن

ذہن پر تنگ ہوا جب بھی اندھیرے کا حصار　　چند یادوں کے دریچے ہیں، جو کام آئے ہیں

تجربات ذہن میں آئے، زباں سے کہہ دیں گے　　ندیم، جن کے مقدر بندھے ہیں دار کے ساتھ

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی ہے پو بھی　　کبھی دنیا میں اندھیرے نہ جہانگیر ہوئے

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے　　کوئی بولے تو برا لگتا ہے
مثلِ خورشید ہوئی ہے افقِ فن پہ طلوع　　یہ حقیقت کہ جو شاعر ہے، وہ انسان بھی ہے

شاعری میں ایک چیز ہے، جسے اصطلاحاً استفادہ کہتے ہیں، یعنی ہر شاعر اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کرتا ہے، اس طرح مختلف اسالیبِ بیان اس کے سامنے آتے رہتے ہیں اور بعض اسالیب سے وہ دانستہ یا نادانستہ (بیشتر نادانستہ) خود بھی کام لیتا ہے۔ اسی طرح بعض اساتذہ نے

افکار میں جدتیں پیدا کرتا ہے۔ ندیم کے ہاں بھی استفادے کی مثالیں ملتی ہیں اگرچہ بہت کم ہیں اور جتنی مثالیں میری نظر سے گزریں اُن میں حسن ہی نظر آیا۔ ملک قمی کا مشہور شعر ہے:

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر   یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

ندیم کہتا ہے:

پل پل میں تاریخ چھپی ہے، گھڑی گھڑی گرداں ہے ندیم
ایک صدی کی ہار بنے گی، ایک نظر کی بھول یہاں

میرزا غالب کہتے ہیں:

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا   بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

دیکھیے ندیم نے اس اسلوبِ بیان سے کتنا عمدہ شعر پیدا کر لیا:

فقط اک ذوقِ پرستش کی نقوش آرائی   دیر اگر دیر نہ ہوتے تو حرم ہو جاتے

خواجہ حافظ کہتے ہیں:

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

لیکن ندیم نے اسے ایک اور ہی رنگ میں پیش کیا ہے:

ہم تو ہیں حسن کے تاریخ نگار   ہم نے قیصر نہ سکندر دیکھے
نظر آئے انھیں سجدے میں بھی سانپ   ہم نے پتھر بھی ثمر ور دیکھے

جو لوگ حقائقِ حیات سے بے بہرہ ہوتے ہیں انھیں ایک خوب صورت اور نظر افروز منظر میں بھی خطرے دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت شناس کو سنگلاخ چٹانیں بھی ثمر وری سے معمور نظر آتی ہیں۔

میں نے ندیم کی شاعری کے متفرق پہلو جنھیں میرے نزدیک بنیادی حیثیت حاصل ہے پیش کر دیے۔ ممکن ہے اس طرح کلامِ ندیم کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کسی حد تک سہولت کا انتظام ہو جائے۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ نہ میں فنی نقاد ہوں نہ اس نقد و تبصرہ کو فنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک عام خواندے کی حیثیت میں جو پہلو مجھے دلکش نظر آئے انھیں اپنی بساطِ نظر کے مطابق صفحۂ قرطاس پر پھیلا دیا ہے۔ اور اربابِ فن ایسی کسی چیز کے محتاج نہیں۔ مجھ ایسے لوگوں

کے لیے خامہ فرسائی کا یہ ناچیز اندوختہ شاید معاون ثابت ہو سکے۔ ندیم کی شاعری کا ایک جامع مرقع "شعلۂ گل" کی نظم "ادب و سیاست" میں پیش ہوا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ اگر آدم افگنی کا دستور ہی جزوِ ریاست ہے۔ اگر انسان فروشی اب بھی جائز ہے۔ اگر آزادی کی تمنا اور انصاف کا تقاضا آج بھی جرم ہے:

اگر روٹی طلب کرنا جہالت ہے، بغاوت ہے   توکل کا عقیدہ ہی اگر محنت کی اُجرت ہے

تو میں ایسی سیاست پر فدا ہونے سے باز آیا
محبت میری فطرت، آدمیت میرا سراپا

میرے پیشِ نظر رعنائی، امن، جوانی اور انسان کا حسنِ جاودانی ہے۔ میں مشینوں کے دھوئیں کو جانِ سپاہی کی اُجرت اور مرقع گالیوں کو خدمت گزاری کی قیمت نہیں سمجھتا۔ میرا نصب العین یہ ہے کہ محنت کش دہر کے آقا بنیں اور تخلیقِ خالق کے پہلو میں بیٹھے۔ مجھے ماؤں کو فقر و فاقہ سے آزاد کرنا ہے اور بچوں کے چہروں میں گلابی رنگ بھرنا ہے:

محبت چاہیے مجھ کو، صباحت چاہیے مجھ کو   بغاوت ہے اگر یہ تو بغاوت چاہیے مجھ کو

یہی میرا ادب ہے اور یہی میری سیاست ہے
مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے

میرے جمہور کے خون سے ایوان بجتے رہے، اب ان کے قدموں کی چاپ سے آمروں کے کان بجتے ہیں:

وہ اُٹھے قافلہ در قافلہ پورب سے پچھم سے   وہ لپکے کارواں در کارواں اقصائے عالم سے
ملوں سے مرغزاروں سے بنوں سے کوہساروں سے   دکانوں سے گھروں سے علم و دانش کے اداروں سے
خلش اُن کے دلوں میں اجتہاد ان کی نگاہوں میں   بچھی جاتی ہیں جمہوری روایات ان کی راہوں میں
مرا فن ان کی عظمت کا جب استقبال کرتا ہے   تو استحصال مجھ پر کفر کا الزام دھرتا ہے

اگر یہ کفر ہے اس کفر کو ایماں بنا دوں گا
مگر دم ظلمتِ شب کے ترانے میں نہ گاؤں گا

یہ ۱۹۵۰ء کی نظم تھی۔ ندیم نے ۱۹۴۱ء میں یعنی اب سے بائیس سال پیشتر دعائیہ انداز

میں ایک نظم کہی تھی۔ اس میں بھی یہی تڑپ پائی جاتی ہے۔ اسی پر اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں!

کملائی ہُوئی روح کو یارب بگُلِ تر کر	اس جامِ سفالیں کو کبھی ساغِرِ زر کر
جب تیرے اشارے سے چٹک جاتے ہیں غنچے	اُمّید کی منہ بند کلی پر بھی نظر کر
دل کو۔ جسے خاکسترِ دل کہتی ہے دُنیا	انوار کی لَو ڈال کے تابندہ شرر کر
. . . .	. . . .
گر نخلِ تمنّا کو ثمر ور نہیں کرتا	افسانۂ اکرام بہ عنوانِ دگر کر
اس پر بھی اگر تیرا اکرم کچھ نہیں کرتا	گستاخ کلامی سے مری قطعِ نظر کر

یہ بھی نہیں منظور تو اے مبدءِ الطاف

احساس مرا چھین، مجھے خاک بسر کر

(مولانا) غلام رسول مہر

مسلم ٹاؤن، لاہور

یکم فروری ۱۹۶۳ء